اِقبالیّاتِ سیّدِ ملتانی

پروفیسر جعفر بلوچ

Scanned with CamScanner

انتخابیات

اسد ملتانی

مرتب

جعفر بلوچ

اقبال اکادمی پاکستان

Scanned with CamScanner

جُملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: پروفیسر شہرت بخاری
ناظم اقبال اکادمی پاکستان

طبع اوّل: ۱۹۸۴

طبع ثانی: ۱۹۹۱ء

مطبع: مڈوے پریس لاہور

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: ساٹھ روپے

نگران طباعت: فرخ دانیال

سیلز آفس: اقبال اکادمی پاکستان۔ ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور۔ فون ۵۷۲۱۴

انتساب

اپنے مربّی اور محسن

حکیم حاجی عبدالکریم خان بلوچ کلاچی مرحوم و مغفور (لیہ)

کے نام

اگر کشادہ جبینم گلِ بہارِ توام
وگر سیاہ دلم داغِ لالہ زارِ توام

جعفرؔ

فہرست

حرفے چند ——— از مرتب ——— ۵

دیباچہ ——— پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ——— ۸

اسد ملتانی ایک تعارف ——— از مرتب ——— ۱۲

اقبال اور اسد ملتانی ——— " " ——— ۲۶

دید و شنید (مضامینِ اسد ملتانی)

شبنم کا قطرہ ——— ۴۸

فیضانِ اقبال ——— ۶۱

اقبال انا اور تخلیق ——— ۷۹

حسنِ ارادت (منظوماتِ اسد ملتانی)

سوال بہ اقبال ——— ۹۷

اقبال ——— ۹۸

مرثیۂ اقبال ——— ۱۰۰

غمِ اقبال ——— ۱۱۱

مقصودِ اقبال ——— ۱۱۲

یادِ اقبال ——— ۱۱۵

شعرِ اقبال ——— ۱۱۶

جناحِ و اقبال ——— ۱۱۸

کارنامۂ اقبال ——— ۱۱۹

یومِ اقبال ——— ۱۲۰

کلامِ اقبال کا انگریزی ترجمہ ——— ۱۲۳

پیغامِ اقبال ——— ۱۲۵

عصرِ اقبال ——— ۱۲۸

پیغامِ اقبال اور ہم ——— ۱۲۹

اقبال سے سوال ——— ۱۳۱

سیرتِ اقبال ——— ۱۳۴

متفرق اشعار ——— ۱۳۶

حرفے چند

۱۹۷۴ء میں حکیم سید عبدالمجید راحی اور میں نے مطلعین شائع کرائی تھی جس کا مطلع اوّل راجہ محمد عبداللہ نیاز اور مطلعِ ثانی جناب اسد ملتانی تھے علمی و ادبی حلقوں میں "مطلعین" کی پُرجوش پذیرائی ہوئی اور اس پذیرائی نے مجھے اردو ادب کے ان دونوں زعما کے بارے میں مزید کام کرنے کا حوصلہ بخشا۔

مطلعین، کی اشاعت کے بعد جناب اسد کے بھائی جناب محمد اکرم خان مدیر الشمس کی زبانی معلوم ہوا کہ کلامِ اسد جو جناب اسد نے خود مرتّب کیا تھا، تلف ہو گیا ہے۔ ادھر اہل علم و نظر کی طرف سے اس قومی و ملّی شاعر کے کلام کی اشاعت کے لیے مسلسل پُراشتیاق تقاضے ہو رہے تھے۔ چنانچہ میں نے جناب اسد کے مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کا کام بھی شروع کر دیا اور کئی سالوں کی محنت کے بعد نظم و نثر میں اسد صاحب کی تقریباً تمام مطبوعہ نگارشات اکٹھی کر لیں۔ اس دستیاب ادبی سرمایہ کی پہلی قسط "اقبالیاتِ اسد ملتانی" کی صورت میں ارباب علم و ادب کے حضور میں پیش کی جا رہی ہے۔ امید ہے یہ مختصر پیش کش اقبالیات سے شغف رکھنے والوں اور جناب اسد کے قدردانوں کے لیے ایک گراں بہا ارمغان ثابت ہو گی۔ اقبالیات اسد ملتانی میں حضرت علامہ اقبال سے متعلق جناب اسد ملتانی کی نگارشاتِ نظم و نثر پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ مختصر کتاب جناب اسد کے دو مضامین، سولہ منظومات اور چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آغاز میں جناب اسد کی شخصیت اور حضرت

علامہ اقبال سے ان کے روابط و مراسم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبالیاتِ اسد ملتانی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس صاحبِ قلم کی تحریریں ہیں جسے حضرت علامہ کا شاگرد رشید ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت علامہ اقبال کے حلقہ تلامذہ میں وہ غالباً واحد ایسے خوش نصیب ہیں۔ جن کی حضرت علامہ سے فیض یابی کا دستاویزی ثبوت آج بھی موجود ہے حضرت علامہ نے ان کی نظم پر اپنے ہاتھ سے اصلاح دی اور اس اصلاح یافتہ نظم کی عکسی شبیہہ جو جناب اسد کے دوامِ شرف کا آئینہ ہے، آج بھی اقبال نامہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے جناب اسد کو حضرت علامہ اقبال کے معاصر نیازمندوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور انہیں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۸ء یعنی علامہ اقبال کی وفات تک کے دوران میں بارہا حضرت علامہ کی علم پرور اور بصیرت افروز صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے مواقع میسر آئے۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد بھی جناب اسد عمر بھر اقبالیات کے مستعد طالب علم رہے۔ سیرت و کردار اور احساس ذمہ داری کے حوالے سے بھی جناب اسد ایک ثقہ اور مستند راوی ہیں چنانچہ انہوں نے حضرت علامہ سے اپنی علمی صحبتوں کی جو ادب آگیں روداد لکھی ہے اسے گنجینۂ اقبالیات کا زرِ کامل عیار سمجھنا چاہیئے۔ حضرت علامہ کے بارے میں جناب اسد کی منظومات کو بھی اس خامہ فرسائی اور قرطاس خراشی پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے جو ہمارے بعض معاصر اور ماقبل شعرا کا طرۂ امتیاز ہے وہ شاخِ مُراد سے ثمر اندوزی کے لیے قوافی کی کلوخ اندازی کے بھی قائل نہیں ہیں۔ علامہ اقبال سے ان کا رشتہ تلمیذانہ مودّت اور دینی اخلاص کا رشتہ ہے چنانچہ ان کی ہر نظم حضرت علامہ سے ان کے، جذباتی اور وجدانی اتحاد کی مظہر اور ایک لازوال تاثر کی حامل ہے۔ امید ہے کہ جناب اسد کی ان یادداشتوں اور منظومات کو دیارِ ادب میں عموماً اور اقبالی حلقوں میں خصوصاً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا!

میں اپنے ان کرم فرماؤں اور دوستوں کا تہِ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے اس

کتاب کی تدوین و اشاعت کے سلسلہ میں میری مدد فرمائی جناب خالد شفیق بٹ خصوصاً میرے تشکّر کے مستحق ہیں کہ اس کتاب کی اشاعت کے مختلف مراحل میں ان کی مشاورت اور معاونت میرے شاملِ حال رہی۔

مَیں مکرمی پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا ممنونِ کرم ہوں کہ انہوں نے میری اس تالیف کا عالمانہ دیباچہ لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ یہ ان کی گہر افشانی کا اعجاز ہے کہ میری بے بضاعتی بھی سرمایۂ نازش دکھائی دینے لگی ہے اور یہ ان کے لطفِ فراواں کا کرشمہ ہے جس نے مجھے بھی غالب کی ہمنوائی میں اس تعلّی آمیز گزارش کا حوصلہ بخشا ہے کہ

خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے
پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی!

جعفر بلوچ
۶۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء
۸۔ غزالی پارک۔ عقب وحدت کالونی لاہور

دیباچہ

جعفر بلوچ ان نوجوان لکھنے والوں کی صفِ اول میں شامل ہیں جن میں بہت سی خداداد صلاحیتیں ہیں وہ اونچے درجے کے شعر فہم ہیں۔ زود گوئی میں بے مثال ہیں اور اس کے علاوہ لفظوں کے مزاج کو خوب پہچانتے ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر میں بہت سا تخلیقی و تحقیقی کام کر رکھا ہے لیکن ہنوز محروم اشاعت ہے چند برس قبل انہوں نے ایک بزرگ کے اشتراک سے ایک کتاب بعنوان "مطلعین" مرتب کی تھی جس میں راجہ عبداللہ نیاز اور اسد ملتانی کے کلامِ بلاغت نظام کی چند جھلکیاں پیش کی گئی تھیں اور اب انہوں نے اسد ملتانی پر مزید تحقیقی مطالعے کا ثمرہ "اقبالیات اسد ملتانی" کی شکل میں اہلِ ذوق کے سامنے پیش کیا ہے۔

اگرچہ دیباچہ نگاری کی روایت یہ ہے کہ اس میں زیرِ نظر تصنیف کو بہر طور سراہا جاتا ہے لیکن روایت کی پیروی سے قطع نظر، میں اقبالیات اسد ملتانی کے مطالعے سے مستفید بھی ہوا ہوں اور محظوظ بھی۔ یہ مختصر سی تالیف اسد ملتانی کی صاف ستھری، پاکیزہ شخصیت کو بخوبی متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ ان کے شاعرانہ کمالات کو بھی بہت حد تک پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ کتاب کو پڑھ کر کم از کم مجھے تو خاصا دکھ ہوا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اسد ملتانی جیسی شخصیات بھلا دی گئی ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر ہیں اور قدرتِ کلام کے باب میں میرے مطالعہ کی حد تک بہت کم معاصرین ان کے حریف ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً پنجاب کے دُور افتادہ مقام سے تعلق

رکھنے کے باوصف اردو ہی نہیں فارسی پر بھی ان کی بے مثال مہارت نے مجھے تو متعجب اور متحیر کر دیا ہے۔

اسی کتاب کے ایک مضمون میں مؤلف نے تصدق حسین خالد کی ایک تحریر کا حوالہ دیا ہے جس میں جناب خالد نے احساس تفاخر کے ساتھ اپنا تقابل اسد ملتانی کے ساتھ کرتے ہوئے انہیں طنزیہ انداز میں ملی شاعر قرار دیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ دو نقاد بھائیوں کی سعیٔ بسیار کے باوجود جدید نظم میں خالد کا آج کیا مقام ہے؟ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اسد ملتانی اگر ملّی شاعر ہیں تو کسی کے نقّال نہیں ہیں یہاں تک کہ اقبال سے متاثر ہونے اور انہیں اپنا مرشد معنوی سمجھنے کے باوجود ان کا مصرع اقبال سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ روایتی مقصدی شاعری کے برخلاف اسد کے ہاں نظموں کی تہ میں ایک خلوص کی لہر جاری و ساری نظر آتی ہے۔ بعض جگہ وہ لطیف طنزیہ انداز میں اپنا مطمح نظر قاری تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ کیفیت ان کی مقصدی و ملّی شاعری کی ہے مگر اس کے علاوہ بھی ان کا بہت سا کلام موجود ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔ "اقبالیات اسد ملتانی" کے مطالعے سے کلام اسد کے بارے میں میری تشنگی بڑھ گئی ہے۔ ایک محدود موضوع پر نظمیں لکھتے ہوئے ان کے ہاں ایسی مہارت و قدرت کلام نظر آتی ہے تو دیگر موضوعات کو نظم کرنے میں انہوں نے کیا کیا کمالات نہیں دکھائے ہوں گے؟

اسی طرح اسد کے مضامین دربارۂ اقبال بھی عام مضامین نہیں ہیں۔ وہ علامہ اقبال کے بہت سے دیگر نیاز مندوں کے مقابلے میں انہیں زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آج کل ہمارے بہت سے دوست اقبال پر لکھتے ہوئے اپنے نظریات کو اقبال سے منسوب کر کے پیش کرنے لگے ہیں۔ یہ دعوے کیا جانے لگا ہے کہ ہمیں مغرب کے نظریات کا تو کیا ذکر ان کی ایجادات کی بھی ضرورت نہیں۔ گویا ہمارے لیے "از بام تا بہ عرش معلّٰے" کافی ہے۔ باقی سب کچھ ہمیں مغرب کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ نظریہ جیسا بھی ہے اس کی تفصیل میں جانے

کی یہاں ضرورت نہیں مگر اسے اقبالؔ سے منسوب کرنا یقیناً غلط ہے۔ اقبال نے جب کہا

حکمتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

تو علم و فن سے مراد جدید سائنسی ایجادات لی ہیں۔ اسد ملتانی نے اس بات کو اپنی تحریر فیضانِ اقبال میں (جو علامہ سے اسد کی ایک ملاقات کا مفصل حال ہے) بالکل واضح کر دیا ہے۔

فرمایا کہ نقل اور اخذ میں بہت فرق ہے۔۔۔۔ نقل سے قوّتِ تخلیق کمزور ہو جاتی ہے مگر اخذ ترقی کے لیے لازمی ہے۔ مغرب نے جو نئی تخلیقات اور ایجادات کی ہیں ہمارے لیے ضروری ہے کہ اُن کو فوراً اخذ کر کے اپنی مزید ترقی کی بنیاد رکھیں۔ ایک یہ امر بھی مدنظر رہے کہ تقلید اور نقالی علوم سائنس میں مذموم نہیں بلکہ ضروری ہے لیکن مذہب، اخلاق اور تمدّن میں یہ زہر کا حکم رکھتی ہے مثلاً ترکوں کو دیکھیے انہوں نے ہیٹ کو علامتِ ترقی سمجھ لیا ہے حالانکہ اصل چیز جو لازمۂ ترقی ہے وہ ہیٹ کے نیچے ہے"۔

یعنی وہی بات جو اقبال نے شعر میں اس طرح کہی ہے۔

علم و فن را اسپِ جوان شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ

آج ہم اقبال کو ایجادات کا مخالف بنا کر پیش کر رہے ہیں تو نہ اقبال کی خدمت کر رہے ہیں نہ اسلام کی۔

غرض اسد ملتانی کے مضامین دوبارۂ علامہ اقبال ان کو درست سیاق و سباق میں دیکھنے اور دکھانے کی کامیاب کوششیں ہیں۔

میں جعفر بلوچ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے قوم کے ایک دیانتدار، شریف اور

باصلاحیت فرد کے بارے میں قلم اٹھایا ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ وہ پاکستان کے دور افتادہ مقام کے اس نامور فرزند پر اپنی تحقیق جاری رکھیں اور ان کے جملہ کارناموں کو یکجا کر کے پیش کریں تاکہ اردو ادب کی تاریخ میں اس نام کا اضافہ کیا جا سکے۔

نامِ نیکِ رفتگان ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
صدر شعبہ اُردو۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹیل کالج۔ لاہور

Scanned with CamScanner

اسد ملتانی — ایک تعارف

جناب اسد ملتانی ان ممتاز پاکستانی اہل قلم میں سے تھے جنہوں نے پاکستان کے قیام کے لیے شب و روز کوششیں اور دعائیں کیں اور پاکستان بن جانے کے بعد یہاں اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ خدا نے انہیں گہرے دینی شعور سے نوازا تھا۔ اور ان کی ذات علم و عمل کا پیکر تھی ان کا کردار ان کی گفتار کی توثیق کرتا تھا بلکہ ان سے بڑھ کر وہ نظیری کے اس مصرع کا مکمل مصداق تھے۔ ع

پارۂ بیش است از گفتارِ ما کردارِ ما

بقول جناب کشفی ملتانی مرحوم[1] "جناب اسد ملتانی سرخ و سپید رنگت، متوسط قامت اور متوازن جسم کے شکیل و وجیہ بزرگ تھے۔ شلوار قمیص اور کلاہ و دستار ان کا مستقل لباس تھا۔ موسم کے مطابق کوٹ یا واسکٹ وغیرہ پہن لیا کرتے تھے۔"

جناب اسد کے بھائی محمد اکرم خان[2] نے جناب اسد کے حالاتِ حیات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ جناب اسد ملتانی کا پورا نام محمد اسد خاں تھا۔ آپ نسلاً شیرانی افغان تھے

---

[1] مدیر ہفت روزہ بشارت، مظفر گڑھ۔ متوفی ۲۱ فروری ۱۹۷۶ء

[2] ایڈیٹر شمس، ملتان۔ متوفی ۲ دسمبر ۱۹۸۲ء

۱۹۰۲ء میں کٹڑی افغانان ملتان شہر میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام غلام قادر خاں تھا۔ ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں سال اوّل میں داخل ہوئے اور اسی سال اپنے کالج میں منعقد ہونے والے نظموں کے انعامی مقابلے میں اول انعام حاصل کیا۔ اس انعامی مقابلہ کا فیصلہ حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کیا[۳]۔ بعد ازاں اسلامیہ ہائی سکول ملتان میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں آپ امتحانِ مقابلہ میں کامیاب ہو کر حکومت ہند کے مرکزی سیکرٹریٹ (نئی دہلی) میں ملازم ہو گئے[۴] وہاں آپ فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں بطور کلرک بھرتی ہوئے تھے۔ پھر ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آ گئے اور وزارت امور خارجہ میں سپرنٹنڈنٹ اور بعد ازاں ریاستہائے و سرحدات کے شعبہ میں اسسٹنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ جناب منشی عبدالرحمٰن خاں آپ کی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"۱/۱۰/۵۳ کو آپ کو ڈپٹی سیکرٹری بنا دیا گیا۔"[۵]

منشی صاحب کے نام جناب اسد کے ایک مکتوب مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۵۳ء سے اس خبر کی توثیق ہوتی ہے۔ جناب اسد اس مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"انگریزی راج قائم رہتا تو میں سپرنٹنڈنٹ ہوتا یا زیادہ سے زیادہ اسسٹنٹ سیکرٹری تک شاید پہنچ جاتا۔ یہ پاکستان بننے کا نتیجہ ہے کہ دوسرے ہی سال سپرنٹنڈنٹ سے اسسٹنٹ سیکرٹری کا درجہ مل گیا اور اب ڈپٹی سیکرٹری

---

[۳] بی اے میں جناب اسد کی سیکنڈ ڈویژن تھی۔ دیکھیں پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر برائے سال ۲۵-۱۹۲۶ء ص ۶۹۸

[۴] نقوش غزل نمبر (فروری ۱۹۶۰ء) میں شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کے مضمون شعرائے متغزلین میں اسد صاحب کے بارے میں لکھا ہے "۱۹۳۶ء میں انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت کی۔" بظاہر یہ سہو کتابت ہے۔ کاتب نے ۱۹۲۶ء کو ۱۹۳۶ بنا دیا ہے۔

[۵] چند ناقابل فراموش شخصیات از منشی عبدالرحمٰن خان ص ۲۸۲

تک ترقی مل گئی ہے۔"[۶]

۱۹۵۴ء میں جناب اسد نے اپنے بھائیوں محمد اکرم خان اور محمد اسلم خان کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مولانا ماہر القادری بھی اس مبارک سفر میں جناب اسد کے ہمسفر تھے اپنے سفرنامۂ حج "کاروان حجاز" میں مولانا ماہر القادری نے متعدد مقامات پر جناب اسد سے اپنی پرلطف صحبتوں کا حال لکھا ہے۔ انہی ایام حج کے دوران میں منیٰ کے مقام پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ مرحوم محمد اکرم خاں کی روایت کے مطابق ایک روز منیٰ میں ایک جگہ غلام محمد (۱۸۸۷-۱۹۵۷ سابق گورنر جنرل پاکستان) کی کار رکی تو انہوں نے جناب اسد ملتانی کو قریب کھڑے پایا۔ کار کا دروازہ کھول کر انہوں نے اسد صاحب کو کار میں بٹھا لیا اور شاہ ابن سعود (دور حکومت ۱۹۵۳ تا ۱۹۶۴ء) سے ملاقات کے لیے چلے۔ شاہ سعود کے ساتھ جناب غلام محمد اور جناب اسد کی یہ ایک مخصوص نشست تھی جس میں چوتھا آدمی صرف ترجمان (INTERPRETER) تھا۔ ملاقات کے دوران میں مہمانوں کو طلائی پیالیوں میں چائے پیش کی گئی۔

اس واقعہ کو جناب اسد نے "ملاقاتِ ملک" کے عنوان سے نظم بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دہم کو منیٰ میں سر رہگزار — گزرتی ملی موٹروں کی قطار
تھا انبوہ اتنا کہ ہر ہر قدم — قطار آگے چلنے سے جاتی تھی تھم
جو گاڑی مرے پاس آکر رکی — جناب غلام محمدؒ کی تھی
بڑھا میں، بڑھایا انہوں نے بھی ہاتھ — ملے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ
محبت سے اندر بلایا مجھے — وہیں پاس اپنے بٹھایا مجھے

۶۔ اندازِ سخن مرتبہ منشی عبدالرحمٰن خاں ص ۹۸

ہوئیں باتیں اور بعد کچھ دیر کے — اجازت جو چاہی تو کہنے لگے
چلا ہوں کہ دوں تہنیت شاہ کو — ہے بہتر مرے ساتھ تم بھی چلو
عجب اتفاقاً یہ صورت ہوئی — کہ دربار شاہی میں شرکت ہوئی
میں احرام باندھے فقیرانہ حال — ادھر بادشاہانہ جاہ و جلال
وہ شاہ سعود ابن عبدالعزیز — جواں بخت و خوش رو و ہر دلعزیز
جسے حق نے از راہِ لطف و کرم — بنایا ہے خدمت گزارِ حرم

ملاقاتِ شاہ اور عجیب اس قدر
رہے گی مجھے یاد اسد عمر بھر [۷]

جناب اسد کے آخری دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے منشی عبدالرحمٰن خان لکھتے ہیں۔

"آپ کی میعادِ ملازمت ۱۶۔ دسمبر ۱۹۵۶ء کو (ختم) ہونی تھی مگر آپ کے وسیع تجربہ اور اعلیٰ قابلیت کے پیش نظر گورنمنٹ پاکستان آپ کی ملازمت میں سال بہ سال توسیع کرتی گئی جس کی وجہ سے آپ کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر مملکت کے سیکرٹریٹ کے عملہ کے ہمراہ بذریعہ سپیشل ٹرین ۲۷ اکتوبر کو راولپنڈی کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ وہاں پہنچنے کے قریباً بیس دن بعد ۱۷ نومبر ۱۹۵۹ء کو آپ ..... ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔" [۸]

شاعری ۔ جناب اصغر حسین خان نظیر لودھیانوی بیان کرتے ہیں۔

"اسد ملتانی کی شاعری کا آغاز آٹھ نو برس کی عمر سے ہوا تھا۔ ان دنوں

---

[۷] تحفۂ حرم از اسد ملتانی ص ۲۴، ۲۵
[۸] چند ناقابل فراموش شخصیات۔ ص ۲۸۲، ۲۸۳

ملتان چھاؤنی میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اسد ان میں شریک ہوتے مگر خود کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ مصرع طرح پر احباب کو غزلیں لکھ دیتے اس طرح مشق سخن جاری رہی۔ سب سے پہلی غزل انہوں نے گورنمنٹ کالج (لاہور) کے مشاعرہ میں پڑھی۔ یہ غزل بہت پسند کی گئی اور اس حوصلہ فزائی نے شوق کو تیز کیا اور آپ کالج کے مشاعروں اور کالج کے رسالہ "راوی" میں نظمیں لکھنے لگے [۹]"

جناب محمد اکرم خاں فرماتے تھے کہ شاعری میں آپ کسی کے باقاعدہ شاگرد نہ تھے حضرت علامہ اقبال نے آپ کی ایک نظم "قطرۂ شبنم" پر از خود اصلاح فرمادی تھی جو آپ کے لیے ہمیشہ باعثِ فخر و مباہات رہی۔

جناب اسد کا اردو اور فارسی کلام ملک کے مقتدر اخبارات اور جرائد مثلاً زمیندار انقلاب، معارف (اعظم گڑھ) طلوع اسلام، نیرنگِ خیال، ہمایوں، فاران (کراچی) نمکدان اور عالمگیر (لاہور) میں شائع ہوتا تھا۔ بعض فارسی نظمیں ایران اور افغانستان کے رسائل میں بھی شائع ہوئیں۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "شعر و شاعری کا شوق اٹھ نو برس کی عمر سے ہوا اور عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ وہ ایک مشہور اور کامیاب شاعر ہیں۔" [۱۰]

مولانا ماہر القادری جناب اسد کے کلام کے بارے میں اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔ "اسد ملتانی مرحوم کا کلام "اقبالیات" کا سلسلۃ الذہب ہے" [۱۱]

---

[۹] تذکرہ شعرائے اردو۔ از اصغر حسین خان نظیر لودھیانوی ص ۲۵۵

[۱۰] نقوش غزل نمبر فروری ۱۹۶۰ء ص ۷۰۳

[۱۱] راقم کے نام مولانا ماہر القادری کا ایک مکتوب مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۷۵ء

جناب رفیق خاور مدیر ماہنامہ ماہ نو نے جناب اسد کی وفات پر لکھا۔

"بزمِ سخن آج ماتم میں ہے۔ اسد ملتانی جن سے حالی، اکبر اور اقبال کے دور کی یاد تازہ تھی۔ ہم سے رخصت ہو گئے۔"[۱۲]

لیکن جناب اسد کی شاعری کی قابلِ رشک داد وہ ہے جو انہیں حضرت علامہ اقبال اور حضرت قائداعظم سے حاصل ہوئی۔ حضرت علامہ اقبال کی رائے آئندہ سطور میں درج ہو گی۔ حضرت قائداعظم سے جناب اسد کے ایک شعر پر داد ملنے کی دلچسپ روایت جناب عاشق حسین بٹالوی نے بیان کی ہے۔ بٹالوی صاحب نے حضرت قائداعظمؒ کے ایما پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۳۹ء کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی تھی جس پر سر سکندر کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بحث نہ ہو سکی۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:۔

ہنگامے کے دوران میں جب یونینسٹ پارٹی کے ارکان نے مجھ پر فقرے کسنا چاہے تو جواب میں میری زبان سے یہ شعر نکل گیا ؎

رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

اس پر ایوان میں وہ بے تماشا تالیاں بجیں کہ کئی منٹ تک سکوت نہ ہو سکا۔ اجلاس کے دو روز بعد جب میں قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مسکرا کر فرمانے لگے۔ "وہ شعر دوبارہ سناؤ۔" میں نے شعر پڑھا تو بہت محظوظ ہوئے میں نے عرض کیا کہ اگر ارشاد ہو تو اس کا انگریزی میں ترجمہ پیش کروں۔ فرمایا۔ "میاں۔ میں فارسی جانتا ہوں۔ اردو کیا چیز ہے؟" پھر میں نے کاغذ پر وہ شعر لکھ کر نذر کیا۔ یہ شعر اسد ملتانی کا ہے۔"[۱۳]

---

[۱۲] ماہ نو جنوری ۱۹۶۰ء۔ مضمون اک شمع رہ گئی تھی ..... کا تمہیدی نوٹ

[۱۳] قائداعظم میری نظر میں۔ مرتبہ صفیہ سلطانہ انور ایڈیشن جنوری ۱۹۵۳ ص ۵۰-۴۹

جناب اسد کا زیادہ تر کلام اُردو زبان میں ہے۔ متعدد نظمیں اور غزلیں فارسی میں اور چند سرائیکی میں بھی کہیں۔ اردو ادب کی کم نصیبی ہے کہ جناب اسد کا مکمل مجموعۂ کلام تاحال شائع نہیں ہوا۔ البتہ ۱۹۳۸ء میں چھوٹا سا رسالہ "مرثیۂ اقبال" کے نام سے اور ۱۹۵۴ء میں دوران سفر حج کی نظموں کا ایک مختصر مجموعہ "تحفۂ حرم" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پھر ۱۹۷۴ء میں جناب اسد کی چند نظمیں اور غزلیں "مطلعین" میں شائع ہوئیں۔[۱۴]

یہاں جناب اسد کی شاعری کے جائزہ و تنقید کا موقع نہیں تاہم ان کی متفرق غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دل سوزِ محبت سے وقف تب و تاب اچھا
یا مرقدِ پہلو میں آسودۂ خواب اچھا
دے کر تپش الفت گرما دیئے دل کتنے
زاہد کی بزرگی سے اس بت کا شباب اچھا
اے حسن، محبت بھی طالب ہے تلون کی
اک وقت خطاب اچھا، اک وقت عتاب اچھا

کسی کے لطف سے قائم ہے زندگی ورنہ
کوئی قدم بھی ہمارا عدم سے دُور نہیں
پتے کی بات کہی خضر نے کہ منزلِ دوست
نظر سے دُور ہے لیکن قدم سے دور نہیں

---

[۱۴] یہ کتابچہ میں نے حکیم سید عبدالمجید راحی کے تعاون سے ۱۹۷۴ء میں مظفر گڑھ اکادمی کے زیر اہتمام شائع کیا تھا۔ (جعفر)

اسد عجیب ہے میرا نگار خانہ، دل
اگرچہ دیر ہے لیکن حرم سے دُور نہیں

فروغِ شعر و ادب کے سلسلے میں جناب اسد کا ایک اہم کارنامہ بزم اُردو شملہ کا قیام ہے۔ اس کے بارے میں منشی عبدالرحمٰن خان لکھتے ہیں۔

"قیام شملہ کے دوران آپ نے بزم اردو کی بنیاد ڈالی جس کے آپ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ آپ شملہ میں ہر سال ایک عظیم الشان مشاعرہ کیا کرتے تھے۔ وہ مشاعرے اتنے اہم اور اعلیٰ سوسائٹی میں اتنے مقبول ہوتے تھے کہ ان کے ٹکٹ اکثر وزراء کی سفارش پر ملا کرتے تھے ایک مشاعرہ کی صدارت مسٹر غلام محمد نے کی جو آخر میں پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدہ تک پہنچے تھے۔ ان مشاعروں میں شریک ہونے والے زیادہ تر اونچے طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مشاعرہ میں ۱۹ "سر" موجود تھے۔" [۱۵]

صحافت: اُردو صحافت اور خصوصاً ملتان میں اُردو صحافت کے ارتقاء کے سلسلے میں بھی جناب اسد نے اہم خدمات سرانجام دیں

جناب اسد کی صحافتی خدمات کا تذکرہ جناب شبیر حسن اختر نے اس طرح کیا ہے۔

"اس کے بعد ملتان کی صحافت کا باقاعدہ آغاز یہاں کے مایۂ ناز شاعر جناب اسد ملتانی کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے ۲۸۔ نومبر ۱۹۲۲ء کو "الشمس" کے نام سے ہفتہ وار اخبار اور انعام کے نام سے ماہنامہ نکالا۔۔۔۔۔ ہفتہ وار "الشمس" ملتان کا پہلا

---

[۱۵] چند ناقابلِ فراموش شخصیات: ص ۲۷۴

باقاعدہ اخبار تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہندوستان کے طول و عرض کو عبور کر کے جاوا عراق، اور مشرقی افریقہ تک پہنچتا تھا۔ ہفتہ وار الشمس، ہندو مسلم کشاکش کی وجہ سے ۱۹۲۳ء کے وسط میں بند کر دیا گیا لیکن اس نے تھوڑے سے عرصے میں یہاں کی صحافت میں ایک ایسی روح پھونکی کہ اس کے بعد بہتیرے اخبارات منظر عام پر آنے لگے اور بالآخر یہ سلسلہ روزنامہ اخبار کے اجرا پر منتج ہوا۔ [۱۶]

دینداری اور حسنِ کردار : جناب اسد کی دینداری کی شہادت ان کے تمام معاصرین دیتے ہیں۔ مولانا ماہر القادری لکھتے ہیں۔

"صوم و صلوٰۃ کے پابند۔ دینداری ان کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے فدائی اور شیدائی صوفیائے کرام کے عقیدت مند مگر شرک و بدعت سے کوسوں دور اور انتہائی بیزار۔ پاکستان کو کتاب و سنت کی بنیاد پر صحیح اسلامی حکومت دیکھنے کے تمنائی۔" [۱۷]

جناب محمد ایوب اولیا کی رائے ہے:

"حلقہ شعرا میں ایسے حضرات خال خال ہیں۔ جو ادیب و شاعر ہوتے ہوئے بھی با اخلاق، ذہنی صحت مند اور متدین ہوں ..... ایسے لوگوں میں سے ایک حضرت اسد ملتانی بھی تھے۔" [۱۸]

جناب منشی عبدالرحمٰن خان کا بیان ہے۔

---

[۱۶] ملتان قدیم و جدید ص ۱۱۴

[۱۷] فاران۔ جنوری ۱۹۶۰ء

[۱۸] نمکدان۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۹ء

"اپنے ۳۳ سالہ تعلقات کے دور میں راقم نے ان سے کوئی خلافِ شرع بات ہوتے نہیں دیکھی"۔ [۱۹]

جناب جمیل نقوی رقمطراز ہیں :-

"قرآن اور حدیث پر انہیں کامل ایمان تھا اور اس سلسلہ میں وہ کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتے تھے حتیٰ کہ ان کے ایک دیرینہ دوست (جناب غلام احمد پرویز؟) نے ایک مشہور رسالہ (طلوع اسلام؟) میں جب اس مسئلہ پر ایسے خیالات کا اظہار کیا جن سے اسد مرحوم کو اختلاف تھا تو مرحوم نے اپنے مکان پر ہفتہ وار جلسوں کا انتظام کیا اور ایک مشہور عالم دین [۲۰] کو اس فتنہ کو دبانے کے لیے مواعظ کی دعوت دی۔ پند و موعظت کا یہ سلسلہ اُن کے راولپنڈی جانے تک جاری رہا"۔ [۲۱]

اس سلسلہ میں مولانا ماہر القادری کی رائے بھی ملاحظہ ہو۔

"ماہنامہ طلوع اسلام میں اسد ملتانی کی برسوں نظمیں چھپتی رہی ہیں۔ اس لیے اوروں کا کیا ذکر کیجیے، خود میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اسد صاحب منکرینِ حدیث کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان سے ملنے کے بعد یہ غلط فہمی دور ہوئی [۲۲] کہ وہ تو انکارِ حدیث کو دین کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتے ہیں۔ اور سنت رسولؐ کے دین میں حجت ہونے کا محکم عقیدہ رکھتے ہیں۔ مسٹر

---

[۱۹] چند ناقابلِ فراموش شخصیات ص ۲۷۵

[۲۰] یہ مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں۔ خطوط اسد بنام حیرت شملوی۔ فاران مئی و جون ۱۹۶۰ء

[۲۱] ماہ نو۔ جنوری ۱۹۶۰ء مضمون۔ اک شمع رہ گئی تھی.....

[۲۲] معلوم ہوتا ہے یہاں حرف (کہ) کاتب سے سہواً لکھا گیا (جعفر)

پرویز کے وہ بہت مخالف تھے اور شکوہ کرتے تھے کہ یہ شخص علامہ اقبال کو اپنے مسلک کی تائید میں غلط طور پر پیش کرتا ہے۔" [۲۳]

معلوم ہوتا ہے حدیثِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں پرویز صاحب کے نقطۂ نظر سے جناب اسد کا اختلاف نہ صرف قائم رہا بلکہ روز بروز بڑھتا گیا۔ ۱۹۵۴ء کے بعد ان کی کوئی نظم طلوع اسلام میں نہیں چھپی۔ ان کی زندگی کے آخری پانچ سالوں کا کلام زیادہ تر ماہنامہ ماہ نو اور فاران کراچی میں شائع ہوتا رہا۔ تاہم پرویز صاحب سے قدیم مراسم کی بنا پر جناب اسد نے مروت کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑا وہ پرویز صاحب کے نقطۂ نظر کی اصلاح کے لیے بڑے سلیقے سے دوستانہ کوششیں بھی کرتے رہے۔ چنانچہ جناب حیرت کو ۱۶ر جون ۱۹۵۳ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"مولانا محمد ایوب صاحب واحدی صاحب اور پرویز صاحب کو ایک جگہ جمع کیا تھا کہ باہم قریب ہو سکیں، لیکن توقع پوری نہ ہوئی۔ اندازِ ملاقات مناسب رہا، لیکن گفتگو یک طرفہ رہی یعنی مولانا بولتے رہے اور پرویز صاحب سنا کیے۔" [۲۴]

خود پرویز صاحب نے بھی طلوع اسلام کی تبدیل شدہ پالیسی سے جناب اسد کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ جناب اسد کی وفات پر "حسرت آمیز" کے عنوان سے جناب پرویز نے لکھا:

"اسد صاحب کو علامہ اقبال سے قلبی لگاؤ تھا اور اسی وجہ سے طلوع اسلام سے انہیں والہانہ دلبستگی رہی دکچھ عرصہ سے انہیں بعض امور میں اس

---

[۲۳] فاران۔ جنوری ۱۹۶۰ء

[۲۴] اسد ملتانی مرحوم کے خطوط عبدالمجید حیرت شملوی کے نام ماہنامہ فاران کراچی۔ جون ۱۹۶۰ء

سے اختلاف ہو گیا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، اسلام کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست تھی اور ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا خیال ان کی زندگی کا جزو۔ تحریک پاکستان کے ساتھ ان کی شیفتگی کا یہی جذبۂ محرکہ تھا۔ اور یہی وہ جذبات تھے جو شعر بن کر ان کے لب پر آجاتے تھے۔" [۲۵]

میں یہ بات نہایت دیانت داری اور مکمل احساسِ ذمہ داری سے عرض کرتا ہوں، کہ جناب اسد ملتانی تحریکِ پاکستان کے عظیم ترین شعراء میں سے تھے اور مجھے یقین ہے کہ تحریکِ پاکستان اور اُردو شاعری کے روابط پر نگاہ رکھنے والا ہر دیانت دار ناقد میری تائید کرے گا۔ جناب اسد کی نظمیں پاکستان کی تحریک اور تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ان کی ایک نظم بعنوان ملتان، ماہنامہ معارف میں جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

گر کنوں تشکیلِ پاکستان شود
مرکزِ آں مملکت، ملتاں شود

گویا "پاکستان" کا لفظ انہوں نے جنوری ۱۹۳۵ء میں استعمال کیا جب پاکستان ابھی ہیولائی ہیئت میں تھا۔

جناب اسد ملتانی بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کا پیکر تھے۔ حق گوئی و بے باکی ان کی سیرت کا نمایاں وصف تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے پاکستان کو لادینی ریاست بنانے کا خیال ظاہر کیا تو جناب اسد نے اپنے ردِ عمل کا یوں اظہار فرمایا ؎

نیا ملک ہم کو دیا ہے خدا نے
کہ ہو اس میں جاری نظام محمدؐ

---

[۲۵] طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۵۹ء

حکومت کا آئین دینی نہ ہو گا
یہ کیا کہہ رہا ہے غلام محمد [۲۶]

جناب محمد اکرم خان فرماتے تھے کہ یہ نظم جناب اسد نے خود گورنر جنرل کے سامنے ایک جلسۂ عام میں بھی پڑھی تھی۔

جناب اسد ناجائز ذرائع سے کام نکالنا گناہ سمجھتے تھے۔ حج کا ارادہ فرما چکے تھے مگر قرعہ اندازی میں آپ کا نام نہ آیا تھا۔ ایک جہاز راں کمپنی جس کا نام پین اسلامک سٹیم نیویگیشن کمپنی PAN ISLAMIC STEAM NAVIGATION COMPANY تھا، آپ کو اپنے مخصوص کمرہ میں جگہ دینے پر آمادہ تھی مگر آپ نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔ ریاست ہائے و سرحدات (STATES AND FRONTIER) کے حصہ کی کچھ نشستیں امیدواروں کے نہ ہونے کی وجہ سے آخر تک خالی پڑی رہیں۔ آپ سے گزارش کی گئی کہ خالی نشستوں پر سفرِ حج کرنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ خالی نشستوں پر فقط انہی لوگوں کا حق ہے جن کے لیے وہ مخصوص کی گئی ہیں۔ بالآخر تین برس بعد آپ کا نام قرعہ اندازی میں نکلا تو آپ نے مروّجہ قانون کے مطابق فریضۂ حج ادا فرمایا۔ [۲۷]

جناب اسد ایک متوکل، مستغنی اور بے لوث انسان تھے۔ جناب کشفی ملتانی کی روایت کے مطابق مظفر گڑھ میں ۱۹۴۹ء کے آل پاکستان مشاعرہ میں جناب اسد کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ کراچی سے تشریف لا کر مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ مشاعرہ کے بعد انہیں تین سو روپے بطور سفر خرچ پیش کئے گئے لیکن انہوں نے صرف

---

[۲۶] طلوعِ اسلام۔ جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

[۲۷] بروایت جناب محمد اکرم خاں مدیر الشمس۔ ملتان

ایک سو روپیہ لینا قبول کیا اور فرمایا کہ میرے مصارفِ سفر اس سے زیادہ نہیں۔ جناب اسد ملتانی ایک معمولی استاد کے درجے سے ترقی کرتے ہوئے وفاقی سیکرٹریٹ کے فارن اینڈ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ تک پہنچے تھے، لیکن اس ترقی نے انہیں برخود غلط، مغرور اور متکبر نہیں بنایا۔ بلکہ وہ ایک متواضع اور متشکر انسان تھے چنانچہ اپنی ترقی پانے کے واقعہ پر انہوں نے جناب منشی عبدالرحمٰن خان کو لکھا۔

"انگریزی راج قائم رہتا تو میں سپرنٹنڈنٹ ہوتا یا زیادہ سے زیادہ اسسٹنٹ سیکرٹری تلک شاید پہنچ جاتا۔ پاکستان بننے کا نتیجہ ہے کہ دوسرے ہی سال سپرنٹنڈنٹ سے اسسٹنٹ سیکرٹری کا درجہ مل گیا اور اب ڈپٹی سیکرٹری تک ترقی مل گئی ہے۔ یہ انتہائی درجہ ہے جو معمولی حالات میں ملنا ممکن نہ تھا۔ بالعموم یہ سی۔ ایس۔ پی (سابق آئی سی۔ ایس) کی پوسٹ ہوتی ہے۔ غیب سے صورت ہوگئی ورنہ توقع بالکل نہ تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے اس مقام پر پہنچایا۔" [۲۸]

جناب اسد کی دلکش شخصیت کی کچھ اور جھلکیاں جناب منشی عبدالرحمٰن خان کی تصنیف "چند ناقابلِ فراموش شخصیات" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دینداری، قرض شناسی اور دیگر محاسنِ کردار کے اعتبار سے جناب اسد کی شخصیت حسنِ عمل کا ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی۔ وہ علم و عمل کی آبرو تھے ہمیں اور پاکستان کی آئندہ نسلوں کو اپنی تعمیرِ کردار کے لیے ایسے اصحابِ قدسی سیر کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

---

[۲۸] اندازِ سخن ص ۹۸

علامّہ اقبال اور اسد ملتانی

جناب اسد ملتانی کا شمار فکرِ اقبال کی تفسیر و توضیح اور تبلیغ و اشاعت کا کام کرنے والے اولون السابقون میں ہوتا ہے۔ حضرت علامہ اقبال سے جناب اسد کی اثر پذیری کوئی ہنگامی اور عارضی چیز نہ تھی بلکہ حضرت علامہ کی شخصیت اور پیغام کا جو گہرا تاثر جناب اسد نے حضرت علامہ سے اپنی پہلی ملاقات میں قبول کیا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا اور جناب اسد عمر بھر فکرِ اقبال کے ان تھک پرچارک رہے۔

جناب اسد ملتانی اپنی نظم "قطرۂ شبنم" پر علامہ اقبال کی اصلاح اور ان کی توجہ خاص کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ۱۹۲۱ء میں انارکلی والے مکان پہ بارگاہِ اقبال میں حاضر ہوئے۔ یہ ان کی حضرت علامہ سے پہلی ملاقات تھی۔ ہمہ اوستی خیالات کی حامل نظم "قطرۂ شبنم" گورنمنٹ کالج لاہور کے انعامی مقابلے میں اول قرار دی گئی تھی۔ مقابلے کا فیصلہ حضرت علامہ نے فرمایا تھا اور اس خیال سے کہ یہ کہیں شائع ہوگی، اس پر از خود اصلاح بھی دیدی تھی۔ اس طرح جناب اسد کو حضرت علامہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ یہاں اس بات کا مکرر اظہار ضروری ہے کہ اگرچہ کچھ حوصلہ مند اور "استقامت شعار" اصحاب مثلاً شاکر صدیقی شوق سندیلوی، مولانا عبدالمجید سالک، یامین ہاشمی اور چودھری محمد حسین وغیرہ حضرت علامہ سے تلمذ کا دعویٰ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ خواہ مخواہ شعر بازی اور شاعر گری کے سخت مخالف تھے ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج کے کچھ

طلبہ آپ کے پاس ایک مشاعرہ کی صدارت قبول کرنے کی درخواست لے کر آئے تو آپ نے فرمایا:

"صدر تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا البتہ شعر بازی سے تمہیں روکتا ہوں۔ اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو شعر بازی کی ضرورت نہیں اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے۔ لوگ شعر بازی کی طرف اس لیے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش مطالعہ اور محنت کے انہیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامن گیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں بقا کا عنصر موجود ہو۔ آپ نوجوان ہیں آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہیئے۔ ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے تراجم وغیرہ لکھیں۔ اپنی قوم کو اور خود اپنے کو بہتر بنائیں۔" [1]

حضرت علامہ شاعری کو استادی شاگردی سے بالاتر ایک خداداد چیز سمجھتے تھے اور تلمذ کے خواستگاروں کو اس شغل میں وقت ضائع نہ کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ چودھری محمد حسین، جناب ایم اسلم اور تمکین کاظمی صاحب جیسے کچھ سعادت مند علامہ کے ایما پر شعر گوئی سے تائب بھی ہو گئے تھے۔

اپنے اس طرز فکر و عمل کے باوصف حضرت علامہ جوہر قابل کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں حفیظ جالندھری، جناب اسد ملتانی، حفیظ ہوشیارپوری اور پروفیسر محمد اکبر منیر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ حضرت علامہ نے جناب اسد کو نہ صرف اصلاح دی بلکہ آئندہ مواقع پر بھی ہمیشہ انہیں مشفقانہ توجہ سے نوازا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت علامہ جناب اسد کی ذات میں ایک فطری شاعر کی جھلک دیکھ رہے تھے۔

---

[1] اقبال کے چند جواہر ریزے از پروفیسر عبدالحمید ص ۲۵-۲۴

اس عقد تلمذ کے بعد جناب اسد ملتانی نے فکرِ اقبال کی افہام و تفہیم کو اپنی حیاتِ ادب کا وظیفہ بنا لیا۔ اور کلام اقبال کے سمجھنے اور سمجھانے کو اپنا مقصدِ شاعری قرار دے لیا۔ اس سلسلے میں انہیں کوئی دشواری پیش آتی تو وہ براہ راست حضرت علامہ سے رجوع کرتے۔ مثلاً ایک بار اسرار خودی کے مطالعے کے بعد فلسفہ خودی کے بارے میں کچھ سوالات ان کے ذہن میں ابھرے اور اشعار میں ڈھل گئے۔ ان کے جواب میں حضرت علامہ نے جناب اسد کو انگریزی خطبات (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مطالعہ کے نتائج کا ذکر جناب اسد نے اپنے مضمون "فیضان اقبال"[۲] میں کر دیا ہے

جناب اسد ملتانی کے متذکرہ اشعار "سوال بہ اقبال" کے عنوان سے ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ میں مدیرِ معارف کے درج ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔

"شاعر کو ڈاکٹر سر اقبال کے اسرار خودی پڑھ کر جو شکوک پیش آئے ہیں وہ موزوں نغموں میں ادا ہوئے ہیں۔ صوفیانہ مثنوی گلشن راز کا وجود اسی طرح ہوا ہے۔ کیا ہمارے شاعر کے یہ شکوک ہمارے باکمال فلسفی شاعر کو ایک نئے گلشن راز کے کھلانے کی طرف متوجہ نہ کریں گے؟"[۳]

اقبال ایک نئے گلشن راز کی خیابان سازی تو ۱۹۲۷ء میں فرما چکے تھے اور ان کی مثنوی گلشن راز جدید شائع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ایک اور گلشن راز جدید کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ تاہم حضرت اسد ملتانی کے سوالات شنیدنی اور ان کے اشعار دیدنی ہیں۔

---

[۲] یہ مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔

[۳] ماہنامہ معارف فروری ۱۹۳۱ء

پیش اقبال برم اے اسدؔ ایں مشکل خویش
ہست دل در برِ من یا منم اندر دلِ خویش؟
ریختم در صدفِ جسم و بگشتم گوہر؟
یا نیم بیش تر از حاصلِ آب و گلِ خویش؟
پیکرِ از روشنیٔ من مہِ کامل شدہ است
یا بہ پیکر شدہ ام داغِ مہِ کامل خویش؟
مثلِ مجنوں ہمہ تن جلوۂ عریاں باشم؟
یا چو لیلیٰ بشوم روشنیٔ محمل خویش؟
بہرِ گوہر بزنم غوطہ بدریائے وجود؟
یا بہ کشتی بروم در طلبِ ساحلِ خویش؟
باید اوّل کہ بخواہم دل دانا زخدا؟
یا ازاں پیش خدا را طلبم از دلِ خویش؟
بہ تلاشِ خضرِ عشق، جنوں درکار است
یا خرد را بکنم راہبرِ منزلِ خویش؟
دارم امید کہ آں فلسفیٔ صاحب دل
بکشاید بہ کرم عقدۂ ایں سائلِ خویش؟

حضرت علامہ کی فکر کے استدراک اور ان کے خرمن سے خوشہ چینی کے لیے جناب اسد کبھی کبھی ان کی نورانی مجلسوں میں بھی جا بیٹھتے تھے۔ ان کا مضمون فیضانِ اقبال، حضرت علامہ سے ان کی اسی قسم کی ایک ملاقات کی تفصیل پر مبنی ہے جو مارچ ۱۹۳۳ء میں دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اقبال جامعہ ملیہ میں غازی رؤف پاشا کی تقریر کے موقع پر جلسہ کی صدارت کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس ملاقات

میں وضع الفاظ و تراکیب، مغرب کی تقلید، ترکوں کے رویے، اسلام کے مستقبل، حاسۂ مذہبی RELIGIOUS EXPERIECE کی توضیح و انتقال پذیری، غیر معمولی انسان GENIUS مردِ منتظر، مکتوب مجدد الف ثانی وغیرہ موضوعات پر گفتگو ہوئی اور جناب اسد نے اپنے استفسارات پیش کئے۔ کچھ سوالات آپ کے دوستوں امداد حسین اخگر مراد آبادی اور مولوی محمد احمد خاں ندوی نے بھی کیے جو اس ملاقات میں آپ کے ساتھ تھے۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام اور اقبال نامہ کی وساطت سے حضرت علامہ سے جناب اسد کی دو ملاقاتوں کی تفصیل ہم تک پہنچی ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ ملاقاتوں کی حسین اور قیمتی یادیں جناب اسد کے نہاں خانۂ ذہن میں تھیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا تھا۔

"حضرت علامہ سے بعض دوسری ملاقاتوں کے بھی کچھ حالات حافظے میں محفوظ ہیں۔ اگر کبھی توفیق ہوئی تو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔"[۴]

نہیں معلوم کہ یہ یادیں سپردِ قرطاس ہوئیں یا نہیں؟ افسوس ہے کہ مرحوم کا مدون و مرتب ادبی ترکہ قوم تک نہیں پہنچا خدا جانے قوم کی اس محرومی کا سبب ان کے ورثا کی غفلت ہے یا مجبوری؟

طبیعاتی سطح پر تو باہمی افہام و تفہیم کے لیے اکتساب و استفسار ہوتے ہی ہیں، لیکن جناب اسد حضرت علامہ کی ذات اور ان کے افکار میں اس قدر جذب ہو چکے تھے کہ تخیلاتی اور رویائی سطح پر بھی ان کا رشتۂ تلمذ قائم تھا۔ اپنی ایک نظم دعا کا تعارف کراتے ہوئے آپ نے لکھا۔

"یہ اشعار میں نے ۱۹۳۴ء میں لکھے تھے، لیکن ابھی کہیں شائع نہیں ہوئے

---

[۴] طلوعِ اسلام مئی ۱۹۴۱ء

تھے کہ ۱۹۳۶ء میں حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ضربِ کلیم طبع ہو کر سامنے آئی اس میں، دعا کے موضوع پر چند شعر دیکھے جنہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا حضرت علامہ نے میرے ہی ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر جواب دیا ہے اور دعا کے متعلق میرے نقطۂ نگاہ کی اصلاح کی کوشش فرمائی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے ورنہ ظاہر ہے کہ میرے شعر ان کی نظر سے گزرے ہی نہ تھے۔" [۵]

نظم درج کرنے کے بعد مدیر طلوع اسلام نے بھی اس پر حاشیہ آرائی کی ہے فرماتے ہیں۔

تصورات کی ہم آہنگی دیکھیے کہ حضرت علامہ اقبالؒ اپنی نظم کو اس انداز میں لکھتے ہیں۔ گویا اسد صاحب کی نظم کے جواب میں دعا کے حقیقی فلسفہ کی تدریس و تفہیم ہے حضرت علامہ کی نظم کی ابتدا اس انداز سے ہوتی ہے گویا یہ کسی کے استفسار کے جواب میں ہے۔

واقعی شاعر کی دنیا عجیب ہوتی ہے۔"

قارئین کی دلچسپی کے لیے دونوں نظمیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں ؎

اے دل تو ہی بتا کہ میں مانگوں خدا سے کیا
ہوتا ہی ہے جہاں میں ہماری رضا سے کیا
ہے زیست اپنے بس میں نہ موت اختیار میں
مطلب ہمیں پھر اپنی فنا و بقا سے کیا
طوفاں کا زور شور ہے دریا ہے موجزن
آب و ہوا کو آرزوئے ناخدا سے کیا
وقتِ معینہ پہ خزاں آئے گی ضرور
ہوتا ہے عندلیب کے شورِ نوا سے کیا
اس کے سوا کہ دل کا نکل جائے کچھ غبار
ہوتا ہے غم نصیب کی آہ و بکا سے کیا

---

[۵] طلوع اسلام فروری ۱۹۴۱ء

جو حلقۂ کمانِ قضا سے نکل چکا
رک جائے گا وہ تیر مری التجا سے کیا

وہ بھی تو اپنے کام میں مجبور محض ہیں
شکوہ کروں میں کارکنانِ قضا سے کیا

ہر بات سے وہ قادر مطلق ہے بے نیاز
اس کو بھلا غرض ہے مرے مدعا سے کیا

اٹھتے ہیں خود بخود مرے دستِ دعا اسدؔ
ہر چند سوچتا ہوں کہ ہوگا دعا سے کیا

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

وہی شراب وہی ہاؤ ہو رہے باقی
طریق ساقی و رسم کدو بدل جائے

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

(علامہ اقبال)

متذکرہ حکایت سے عجیب تر واقعہ وہ ہے جو حضرت علامہ کی وفات کے بعد ۱۹۳۹ء میں عالم رویا میں ظہور پذیر ہوا۔ ممکن ہے بعض "روشن خیال" اس لطیف حقیقت کو افسانہ و افسوں سمجھ کر ہدف طعن و استہزا بنائیں، لیکن جدید علم نفسیات اس اتصالِ بعدین کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی تشریح و توضیح میں سرگرم تفکر ہے۔

اپنی "نظم بابر" کے پیش لفظ میں جناب اسد ملتانی فرماتے ہیں "اس نظم کے آخری تین شعر ۴ جون کو موزوں ہوئے۔ ۱۴ جون کی صبح کو خواب میں دیکھا کہ حضرت علامہ اقبالؒ کسی جگہ ایک مجمع کے درمیان بیٹھے ہیں۔ میں حاضرِ خدمت ہوا تو فرمایا کہ کچھ تازہ اشعار

لکھے ہیں تو سناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ شہنشاہ بابر کے متعلق تین شعر کہے ہیں، لیکن نظم کی تکمیل کے لیے ابھی کچھ بھرتی کرنا باقی ہے۔ بھرتی، کا لفظ سن کر میری طرف دیکھا اور فرمایا۔ بھرتی مجھے بالکل ناپسند ہے۔ غیر ضروری شعر کبھی نہ کہا کرو۔ مگر وہ تین شعر کون سے ہیں؟ میں نے پہلا شعر سنایا ؎

ایں نکتہ وانمود بدستِ جہاں کُشا
حد وطن، فضائے زمیں را کنارہ نیست

فرمانے لگے یہ شعر خوب ہے۔ مجھے بہت پسند آیا ہے۔ اس کے بعد جب میں نے دوسرے شعر کا پہلا مصرع پڑھا کہ ؎

ما نازمی کنیم بہ ذاتش ولے چہ سُود؟

تو ٹوک کر پوچھا کیا کہا؟

ما نازمی کنیم بیادش ولے چہ سود؟

میں نے دہرایا تو خاموش ہو گئے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہاں کچھ اصحاب ایسے موجود ہیں جو فارسی نہیں سمجھتے۔ اس لیے شعروں کا مطلب اردو میں بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے جاؤ۔ میں نے تعمیل کی۔ تین شعر ختم ہوئے تو آنکھ کھل گئی۔ جاگ اٹھنے پر خواب کی پوری پوری کیفیت ذہن میں تھی۔ جب میں نے "بہ ذاتش" کی جگہ "بیادش" کے اشارہ پر غور کیا تو یہ ایک عمدہ اصلاح نظر آئی۔ چنانچہ میں نے شعر میں اسی کے مطابق ترمیم کر دی۔

اس خواب کے متعلق یہ امور قابلِ ذکر ہیں کہ ایک تو حضرت علامہ کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے انہیں خواب میں دیکھا۔ دوسرے جس شعر میں اصلاح ہوئی ہے۔ اسے میں اپنی طرف سے بالکل مکمل کر چکا تھا اور میرے ذہن میں اس کی اصلاح یا ترمیم کا کوئی خیال نہ تھا۔" [۶]

---

[۶] ماہنامہ طلوع اسلام اگست ۱۹۳۹ء

اس اصلاح کی واقعاتی حیثیت کچھ بھی ہو، اس سے جناب اسد کی حضرت علامہ سے ذہنی اور روحانی طور پر گہری وابستگی کا اظہار بہر حال ہوتا ہے۔

جناب اسد ملتانی نے ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو دی انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام منائے جانے والے یوم اقبال میں بھی شرکت فرمائی۔ اس یوم اقبال کے سلسلے میں جناب میاں محمد شفیع دم۔ش، لکھتے ہیں۔

"انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کو کہ جس کا میں ایک عہدہ دار تھا۔ یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی اپیل پر سارے ہندوستان میں یوم اقبال ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہ کی زندگی میں انتہائی شان و شوکت سے منایا گیا۔" ؎۷

اس سے قبل "اقبال۔ چند یادیں" کے عنوان سے جناب م۔ش کا ایک مضمون ۲۲ر اپریل ۱۹۶۸ء کے نوائے وقت میں شائع ہوا تھا۔ جسے جناب رحیم بخش شاہین نے اپنی تالیف اوراق گم گشتہ میں شامل کیا ہے۔ اس مضمون میں متذکرہ یوم اقبال کی تاریخ ۱۹ر مارچ ۱۹۳۷ء درج ہے، لیکن میاں صاحب کے ۹ر نومبر ۱۹۸۲ء کے بیان کو ان کے سابقہ بیان کا ناسخ سمجھنا چاہیئے۔ اپنے ۲۲۔ اپریل ۱۹۶۸ء کے مضمون میں جناب م ش نے متذکرہ یوم اقبال کو اقبال کی زندگی میں منایا جانے والا اوّلین یوم اقبال بھی قرار دیا تھا، لیکن موجودہ اطلاعات کی بنا پر اولین یوم اقبال منانے کا سہرا خواجہ عبدالوحید کے سر بندھتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ۶ر ستمبر ۱۹۳۲ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام پہلا یوم اقبال منایا، جس کی کارروائی ۷ر ستمبر ۱۹۳۲ء کو روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی۔ ؎۸

جناب اسلم جیراجپوری نے نوادرات میں مسلم برادرہڈ کے یوم اقبال کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

؎۷۔ نوائے وقت ۹ر نومبر ۱۹۸۲

؎۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیں۔ اوراق گم گشتہ مرتبہ جناب رحیم بخش شاہین ص ۲۹۵۔

"دی انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ (لاہور) نے اس سال کے آغاز میں ۹۔جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال ڈے منانے کا فیصلہ کیا..... تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح نو بجے سے رات کے دس بجے تک رکھی گئی تھیں..... کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔جن میں سے مولانا اسد ملتانی کی نظم جو ہمارے دہلی کے قافلے میں گئے تھے، خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے سنی گئی۔" [۹]

اس نظم کا پہلا شعر یہ تھا ؎

شاعروں سے ہے بہت اونچا مقام اقبال کا
کیونکہ ہم آہنگِ قرآں ہے کلام اقبال کا

مکمل نظم آئندہ صفحات میں درج ہے

دوسری طرف علامہ اقبال بھی اسد ملتانی کی صلاحیتوں سے آگاہ تھے۔ بلکہ جناب خضر تمیمی کی روایت کے مطابق ایک بار تو انہوں نے اس بات کا بھی اظہار فرمایا کہ آئندہ پنجاب کی ادبی روایات کو برقرار رکھے جانے کی امیدیں دو نوجوانوں سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ ایک تاثیر اور دوسرے محمد اسد خاں۔ [۱۰]

اسد ملتانی اقبال سے استفادہ اور فیضان اندوزی کو اپنے لیے باعثِ فخر ومباہات سمجھتے ہیں۔ اس آفتابِ ہدایت سے اکتسابِ حدت وحرارت میں انہیں کوئی عار نہیں۔ جب کہ بعض شپرہ چشموں کے لیے اقبال اپنی زندگی میں بھی خیرہ نگاہی بلکہ نابینائی کا سبب بنا رہا اور آج بھی بعض حلقے اس کا نام سن کر اضطراب اور حواس باختگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں اقبال کا قصور؟

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس!

---

[۹] نوادرات از اسلم جیراجپوری ص ۱۲۷-۱۲۶

[۱۰] ملفوظاتِ اقبال۔ مرتبہ محمود نظامی۔ ص ۲۶۹

جناب اسد کسی ایسی نفسیاتی الجھن کے شکار نہیں ہیں۔ مبدأ فیاض نے انہیں جہاں متاع علم و ہنر کے اکتساب کا ذوق بخشا، وہاں سرچشمۂ علم و ہنر کے اعتراف کی توفیق بھی ارزانی فرمائی۔ چنانچہ اسد صاحب نے علامہ کو اپنا استاد مہرباں اور مرشد لکھا ہے۔

یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پا گیا ہے وفات
وہ میرا مرشد و استادِ مہرباں اقبال

اور پھر بڑے رجز یہ انداز میں فرمایا ؎

شعر میں حضرت اقبال کا پیرو ہونا
ہے اگر جرم تو بے شک اسد اقبالی ہے

اقبال سے فیضان اندوزی کا اعتراف جناب اسد نے نثر میں بھی کیا اور اپنی نظموں میں بھی۔ اقبال کے متعلق ان کی سولہ نظمیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ اس میں مرثیہ اقبال جیسی طویل نظم بھی شامل ہے جو علامہ کی وفات کے فوراً بعد کتابی صورت شائع ہوئی تھی۔ اس ترکیب بند میں جناب اسد نے اقبال کو امام فلسفہ و شاعری، پیغمبر بہار، لوائے فطرت پر غالب آنے والا زمزمہ پرداز، شاعرِ حیات، آفتاب مشرق ترجمان حقیقت وغیرہ القاب سے یاد کرتے ہوئے ان کی مختلف خدمات اور حیثیات پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مرثیہ کا مجمل و مکمل دیباچہ "چند الفاظ" کے عنوان سے چودھری غلام احمد پرویز نے لکھا تھا۔ وہ اس مرثیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں "محسوسات کے خوگر انسان کی نگاہیں بالعموم پردہ ہائے مجاز کی رنگینیوں میں محو تماشا ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور اس طرح وہ عروسِ حقیقت کے حسنِ بسیط سے بہت کم بہرہ یاب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے عام طور پر حضرت علامہ کو ایک شاعر ہی سمجھا اور ایک شاعر ہی کی حیثیت سے ان

کا ماتم کیا۔ حقیقت بین نگاہیں ڈھونڈتی تھیں کہ وہ "محرم راز" بھی کہیں ہے جو ان پردوں کے نقش و نگار سے گزر کر اقبال کے صحیح مقام تک پہنچ چکا ہو، نگاہیں اٹھتی تھیں اور مایوس ہو کر لوٹ آتی تھیں۔ جناب اسد مستحق سپاس و امتنان ہیں کہ انہوں نے نگاہ شوق کی حسرت کو طمانیت سے بدل دیا۔

اقبال کا مرثیہ درحقیقت عالم اسلامی کی بے کسی اور یتیمی کا مرثیہ ہے اور اسے وہی شخص لکھ سکتا تھا جس کی انگلیاں نبض ملت پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہوں، جس کا دماغ حقائق قرآنی سے منور اور قلب و روح ملی سے لبریز ہو۔ یہ توفیق حلقۂ اقبال ہی کے کسی رند سرشار کا حصہ تھی اور ظاہر ہے کہ جناب اسد سے بڑھ کر اس سعادت کا مستحق اور کون ہو سکتا تھا۔؟ [1]

ٹیگور کا کہنا ہے۔ "اگر تم ڈوبے ہوئے سورج پر نوحہ کناں رہو گے تو ستاروں کی روشنی سے بھی بے بہرہ ہو جاؤ گے" حوادث انسان کو جگانے اور سرگرم عمل کرنیکے لیے آتے ہیں۔ ان کا اقتضا یہ نہیں ہوتا کہ انسان رونے بیٹھ جائے اور آنسوؤں میں اپنی قوتِ عمل و تسخیر کو تحلیل کر کے ضائع کر دے۔ اسد ملتانی نے بھی رونے رلانے کو اپنا مقصد قرار نہیں دیا بلکہ نظم کے آخر میں پیغام حرکت و عمل دے کر مرثیہ کو نعرۂ جہاد میں ڈھال دیا ہے ؎

اٹھو مقابلۂ گردش زمانہ کریں
حیات و موت کو پابستۂ قضا نہ کریں
فنا یہی ہے کہ دل میں نہ ہو یقینِ بقا
بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں
عجب نہیں کہ یہی بجلیاں حوادث کریں
ہمارے توسنِ ہمت کو تازیانہ کریں

---

[1] مرثیہ اقبال ص ۴-۵

نہ مل سکا طلبِ نیم گرم سے کچھ بھی
اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں
اسی سے ملّتِ خوابیدہ جاگ اٹھے شاید
وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں

اقبال کے متعلق اپنی دوسری نظموں میں بھی جناب اسد نے مختلف اسالیب سے حضرت اقبال کی شخصیت اور شاعری کے متنوع پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ کبھی وہ اقبال کی زبان سے کلام اقبال کی یہ غایت بیان کرتے ہیں کہ قاری کلام اقبال کی وساطت سے قرآن تک پہنچ جائے۔ کیونکہ ؎

محیطِ کائناتِ دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

(نظم : مقصودِ اقبال)

کبھی وہ عام غزل خوانوں اور اقبال میں خطِ امتیاز کھینچتے ہیں (نظم شعرِ اقبال)
کبھی وہ اس خلا کا المناک تذکرہ کرتے ہیں جو اقبال کی وفات سے پیدا ہو گیا ہے ؎

نہیں اٹھتی کوئی پہ درد صدا تیرے بعد — ہو گیا قافلہ محرومِ درا تیرے بعد
نہ رہا عقل و جنوں میں وہ توازن قائم — علم پھر عشق سے بیگانہ ہوا تیرے بعد
غلطی پر جو کوئی ٹوکنے والا نہ رہا — کھو گئے بولہبی میں علما تیرے بعد

(نظم یادِ اقبال)

کہیں قیام پاکستان کو کارنامہ اقبال قرار دیتے ہیں۔ کبھی اقبال کے حوالے سے بین الاقوامی وحدت اسلام کا درس دیتے ہیں۔ کبھی مرید ہندی اور پیر رومی کے مکالموں کی طرز پہ اقبال سے خیالی گفتگو کرتے ہیں اور کلام اقبال سے عصری مسائل کا حل ڈھونڈ کر لاتے ہیں، اقبال سے سوال، اسی قسم کی نظم ہے جس میں مقام عقل، وصل یزداں، امامتِ

اقوام کے سلسلے میں مسلمانوں کی ناکامی، فرنگ سے استفادہ، خود کفالتی اور غایت دینِ متیں کے متعلق سوال کر کے اقبال کے کلام سے جواب فراہم کیا گیا ہے۔ مثلاً

سائل پاکستانی:

تجھ پہ روشن دینِ حق کی اصل و فرع — آشکارا ہم پہ کر اسرارِ شرع
کیا ہے آخر مقصدِ دینِ متیں — کیا ہے آخر حاصلِ شرعِ مبیں

عارف مشرق:

کس نگردد در جہاں محتاج کس — نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!"

کہیں جناب اسد بہشت میں، جناح و اقبال کو ملاقی کراتے ہیں اور تبادلۂ تبریک کے بعد اقبال کی زبان سے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی خواہش کرتے ہیں۔ (نظم: جناح و اقبال)، کبھی کلام اقبال کے انگریزی تراجم پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی اس خیال سے اداس ہو جاتے ہیں کہ اقبال کا فلسفۂ عمل انگریزی میں ترجمہ ہو کر تیز رفتار یورپین اقوام کو تیز تر کر دے گا، لیکن افسوس ہم خود اس پیغام کی برکات سے بالکل تہی دامن ہیں ؎

جو ہر میدان میں پہلے ہی کوسوں ہم سے آگے ہیں
انہیں قوموں کو دیں ہم اور درسِ تیز رفتاری
مسلمانانِ پاکستان شاید چاہتے یہ ہیں
کہ خود سوئے رہیں دنیا کو دیں پیغام بیداری
عمل میں جس سخن کا ترجمہ ہونا ضروری تھا
ہے انگریزی میں اس کے ترجمہ کرنے کی تیاری

(نظم۔ کلام اقبال کا انگریزی ترجمہ)

کبھی وہ اقبال کو اس طرح خراج پیش کرتے ہیں کہ عصرِ حاضر کو عصرِ اقبال قرار دیتے ہیں۔

حق تو یہ ہے عصرِ حاضر عصر ہے اقبال کا

کبھی وہ اس بات پر کڑھتے ہیں کہ قوم اقبال کے پیغام کو فراموش کرتی جا رہی ہے اور اگر فرمودات اقبال کا اقرار ہوتا بھی ہے تو فقط زبان کی حد تک نہ دل اس کی تصدیق کرتے ہیں نہ عمل اس کی تائید!! اپنی ایک نظم "پیغام اقبال اور ہم" میں وہ بڑے کرب کے ساتھ یہ تلخ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ تمدن، شہریت، ذوق، سیاست، غرض ہر شعبے میں ہمارا عمل کلام اقبال کے خلاف ہے۔ وہ کلام اقبال جو ہمیں قرآن اور محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانا چاہتا ہے وہ کلام اقبال جو ناقۂ بے زمام کو اپنے کارواں سے ملا دینا چاہتا ہے ؎

اس نے جو کچھ بھی کہا ہم نے کیا اس کے خلاف
کس قدر ضد ہمیں اقبال کے پیغام سے ہے

اقبال فراموشی اور محرومیٔ عمل کے خلاف ان کی نظم "یوم اقبال، ایک پرخروش احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے یہ نظم طنز و طعن اور احتساب و مواخذہ کا عجیب امتزاج ہے۔ شاعر کے وفور اشتعال نے ہر مصرع کو شمشیر بّراں بنا دیا ہے۔ فرط غیظ میں ہر حرف نیزے کی انی بن کر دلوں کو چھیدتا ہے۔ یہ نظم پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب کا مشہور شاعر متمم بن نویرہ اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے پیچ و تاب کھا رہا ہے نظم کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کوئی یہ مجلس دستور ساز سے پوچھے
کہ سامنے کبھی آیا ہے اس کے یہ بھی سوال
وہ جس کے خواب کی تعبیر ہے یہ پاکستان
نظام ملک کے بارے میں کیا تھا اسکا خیال
کبھی خود اس کی تصانیف میں بھی ڈھونڈا ہے
کہ مل سکے کوئی تفصیل یا کوئی اجمال
کیا تھا اس نے کہیں ان میں رائے کا اظہار
کیے جو قائد اعظم کے نام خط ارسال
یہ خوب ہے کہ تصور تو اس سے لیتے ہیں
مگر بناتے ہیں تصویر کے نئے خدوخال
یہ کس کو حق ہے کہ موجد سے چھین کر ایجاد
کسی جدید نمونے پہ لے اسی کو ڈھال
خیال جس نے دیا اسکی بات بھی نہ سنیں
نہیں ہے کیا یہ اک احساں فراموشی کی مثال

ہوئی ہے قوم کو آخر یہ کس طرح جرأت　　کہ اس فقیر کی سب حسرتیں کرے پامال
اسد جو یوم ہے اقبال کا تو حق یہ ہے
کہ آج قوم کرے اپنے جرم کا اقبال

اسد کے یہاں فیضانِ اقبال کے اعتراف و اقرار کی نہایت یہی نہیں ہے کہ انہوں نے حضرت علامہ کو نظم و نثر میں خراجِ عقیدت پیش کیا اور قوم کو ان کے فرمودات پر عمل پیرا ہونے کا درس دیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حضرت اسد نے پیغامِ اقبال کی تبلیغ و ترویج ہی کو اپنا مقصدِ شاعری قرار دے لیا تھا اور ایک فنکار کے اعترافِ عظمت کے لیے اعلیٰ ترین اسلوب یہی ہے کہ اس کے انداز میں اپنے فن کا اظہار کیا جائے اور اس کے پسندیدہ فنی پہلوؤں کو اپنایا جائے میں شعرِ اسد کو کلامِ اقبال کی صدائے بازگشت کہہ دینا چاہتا ہوں مگر دقت یہ ہے کہ صدائے بازگشت عموماً مبہم اور متغیر ہو جایا کرتی ہے۔ جب کہ شعرِ اسد ان عیوب سے منزہ ہے۔ جناب اسد کا نظریہ فن وہی ہے جو حضرت علامہ کا ہے۔ وہ ابلاغ و اظہار میں صراحت، قطعیت اور راست تخاطب کے قائل ہیں وہ رمز و ایما اور بے کار سخن طرازی کو اپنے زمانے کے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ پھر ان کے نزدیک عظیم شاعری وہی ہے جو بیدار کرتی ہے یہی وجہ تھی کہ علامہ نے حافظ شیرازی کی تردید اور رومی و بیدل کی توصیف فرمائی۔ جناب اسد نے اپنی دو نظموں "معیارِ شعر و ادب" اور "نیا ادب" میں اپنے نظریۂ فن کا اظہار کیا ہے۔ وہ مذاقِ سلیم، حیات انگیزی، دلکشائی، عام فہمی، پاکیزگیٔ مضمون، سوز و گداز اور اخلاق کے لیے فائدہ رسانی کو صحیح ادب کے لوازم قرار دیتے ہیں اور اس شاعری کو مردود ٹھہراتے ہیں جس کی بنیاد، دین بیزاری بے ادبی، عریانی، ہوس پرستی اور تقلیدِ فرنگ پر رکھی گئی ہو۔ جناب اسد کی ان نظموں کے مطالع درج ذیل ہیں ؎

ادب کے حسن کا معیار ہے مذاق سلیم
عبث ہے اس میں جدید و قدیم کی تقسیم!

(معیارِ شعر و ادب)

نہ پاسِ خلق نہ خوفِ خدا نہ شرمِ نبی
نیا ادب ہے کہ سعیٔ فروغِ بے ادبی

(نیا ادب)

جناب مولانا صلاح الدین احمد نے جناب اسد کی نظم "نیا ادب" کی یوں داد دی کہ اُسے معارف کے مارچ ۱۹۴۳ء کے شمارہ سے اخذ کر کے درج ذیل سخن گسترانہ نوٹ کے ساتھ "ادبی دنیا" میں شائع فرمایا۔

"میراجی کے مضمون کے بعد اس نظم کا مطالعہ آپ پر یہ واضح کرے گا کہ ہمارے بعض پختہ فکر شعرا اور ادبا بھی نئی شاعری اور نئے ادب کے متعلق ایک خوفناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جس چیز کو وہ نیا ادب کہتے ہیں، ہم اسے ادب ہی نہیں سمجھتے۔"[۱۲]

جناب اسد طرح طرح سے اقبالؒ کے فکری عناصر کی توضیح و تشریح کرتے ہیں لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ فکرِ اقبال کو کہیں قطع و پیوند و انمساخ سے دوچار نہیں ہونا پڑتا ان کے آئینہ خانہ میں کوئی آئینہ ٹیڑھا اور غلط بین و غلط نما نہیں۔ اس احتیاط ورزی میں شارحین اقبال میں سے اگر کسی کو جناب اسد کا ہمقلم کہا جا سکتا ہے تو وہ مولانا مہر مرحوم ہیں۔

جناب اسد نے خودی، جبر و قدر، عقل و عشق، فقر، تصوف، فلسفہ حرکت و عمل، فرنگی تہذیب، سیاسی مسالک آزادی نسواں غرض فکر اقبال کے ہر پہلو میں اقبال کی ہمنوائی کی ہے اقبال اجتماعیت اور اتحاد کے داعی ہیں تو اسد بھی کہتے ہیں ؎

افراد کا مذہب کی فضا میں پلنا
اسلام کے سانچے میں نہیں ہے ڈھلنا
کیا یہ کبھی ممکن ہے کہ فرداً فرداً
ہم سیکھ سکیں قدم ملا کر چلنا

(نظم فرد و ملت)

اور انہیں افسوس ہوتا ہے کہ ؎

قوم ترشی ہوئی اینٹوں کا اک انبار تو ہے
لیکن اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں

(لامرکزیت)

اقبال اشتراکیت اور جمہوریت کے خلاف لب کشا ہوئے ہیں تو اسد نے بھی ان کی ترجمانی کی ہے ؎

مسلمانوں کے لائق مزدکیت ہے نہ فغفوری
وہ ہے اللہ سے دوری یہ انسانوں سے مہجوری

کیوں حقیقت کے سمندر کو سمجھتا ہے سراب
اے ترے دم سے فروغِ دینِ سوفسطائیاں

اقبال تشکیک وارتیاب سے نجات اور عمل کے فروغ کے لیے عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں تو اسد صاحب بھی اس پر صاد کرتے ہیں ؎

نہیں ہے سوزِ غمِ عشق کی جھلک جس میں
وہ نورِ عقل بھی دل کو سیاہ کرتا ہے

وہ اقبال کے تصورِ فقر کو اپنے مستفسرانہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

فقر ہمت کا نتیجہ ہے کہ مجبوری کا
میں ہوں دنیا سے کہ دنیا ہے گریزاں مجھ سے؟

اقبال بے حجابی نسواں پر طنز آزما ہوتے ہیں تو اسد صاحب بھی فرماتے ہیں۔

جب اختلاط زن و مرد عام ہو جائے — تو ٹوٹ جاتی ہیں جذب و کشش کی زنجیریں
زیانِ جذب یقینی ہے بے حجابی میں — الگ ہیں دل کی خطائیں نظر کی تقصیریں

اقبال کے تتبع میں وہ صوفیا کی بے عملی کو اس طرح ہدف تنقید بناتے ہیں ؎

نہ رہا اہلِ تصوف میں بھی کچھ جذبِ اثر
اب وہاں وجہِ کشش نغمہ قوالی ہے

بعض اوقات تو جناب اسد موضوعاتی اعتبار سے حضرت علامہ کے مشن کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے اس بیان کی صداقت ان نظموں سے واضح تر ہو جاتی ہے جو قیامِ پاکستان، آئین سازی اور استحکام پاکستان کے دیگر مراحل میں جناب اسد کے قلم سے نکلیں اور رشد و ہدایت کی قندیلیں بن کر اپنے زمانے کو منور کرتی رہیں۔ جناب اسد کی شاعری کے اس پہلو کا تفصیلی جائزہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔

موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی جناب اسد پر حضرت علامہ کا فیضان نمایاں ہے۔ مصنوعی فن کاری سے انہیں بھی نفرت ہے وہ بھی الفاظ کے پیچوں میں الجھنے کی بجائے اپنی بات بلا تکلف مخاطب کے دل تک پہنچا دینا چاہتے ہیں وضع تراکیب میں بھی وہ اس خوش ذوقی کا ثبوت دیتے ہیں جو دبستان اقبال کا خاصہ ہے۔ اخذ و اکتساب کے معاملے میں حضرت علامہ بڑی آزادی کے قائل تھے۔

جناب اسد بھی اس سلسلے میں اسی روش پر چلتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم فطرت اور انسان، پیش کی جا سکتی ہے جس میں انہوں نے شیکسپیئر کے اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ؎

BLOW BLOW, THOU WINTER WIND
THOU ART NOT SO UNKIND,
AS MAN'S INGRATITUDE

چل اے ہوائے زمستاں چل اور زور سے چل
تو سرد مہریٔ احباب سے زیاد نہیں!

اور پھر اس پر چار اور موسموں یعنی گرمی، برسات، بہار اور خزاں کا اضافہ کر کے

اصل سے مختلف حیثیت کی ایک نظم بنادی ہے۔ علامہ نے اپنی تحریروں میں عصری افکار و اکتشافات کو ملحوظ رکھا ہے۔ جناب اسد کے ہاں بھی ایسی اصطلاحات اور ایسے افکار ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عصری تقاضوں سے کاملاً آشنا تھے، لیکن ان سے ہم آہنگ ہونے کے بجائے انہیں اپنا ہم آہنگ بنانا چاہتے تھے ضرورت کے تحت وہ برق تازی (BLITZKVIEG) توپ، طیارہ، غواصہ (آبدوز کشتی) دبابہ (ٹینک)، بارود، میگزین وغیرہ الفاظ بلا تکلف استعمال کر جاتے ہیں مثلاً ؎

ہمارے دل سدا معمور ہیں عشق الٰہی سے
یہی بارود رکھتے ہیں ہم اپنے میگزینوں میں

ایک جگہ سر اسحاق نیوٹن کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

مت کہہ کہ پالیا دُرِ دریائے معرفت — ایک سنگریزۂ لبِ ساحل کو دیکھ کر
تحقیق سے گماں کے سوا کیا ملا تجھے — حیراں ہوں تیرے علم کے حاصل کو دیکھ کر
کر علت العلل کی طرف ذہن منتقل — خود اپنے منتہائے دلائل کو دیکھ کر
واللہ تازہ ہوتا ہے ایمان اے اسد — سائنس کے جدید مسائل کو دیکھ کر

بعض اوقات وہ حضرت علامہ کی طرح معمولی واقعات سے غیر معمولی نتائج کا استنباط کر لیتے ہیں۔ ان کی نظمیں بے حسی اور خواب غفلت، اس کی مثالیں ہیں۔ رجائیت اصلاح و تبلیغ کے آئینہ کا جوہر ہے۔ کلام اقبال کی طرح کلام اسد میں بھی نقطۂ نظر ہمیشہ رجائی رہتا ہے یہاں تک کہ مرثیہ اقبال میں بھی وہ غم کے آگے خود سپردگی اختیار نہیں کرتے بلکہ بقول جناب پرویز "پھر یہ چیز بھی قابل دید ہے کہ سحابِ غم میں سے گزرتی ہوئی شعاع امید ذہنی افق پر جو نمناک لیکن درخشندہ قوسِ قزح پیدا کر رہی ہے وہ مرثیہ کی دنیا میں غالباً پہلی مثال ہے۔"[۱۳]

لفظ "غالباً" سے اختلاف کی گنجائش نکالتے ہوئے یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ یاس کی گھٹاؤں سے امید کی شعاعیں کشید کرنے کا فن بھی جناب اسد نے حضرت علامہ

سے سیکھا تھا۔ اس سلسلے میں صرف بانگ درا میں سے سوامی رام تیرتھ گورستانِ شاہی والدہ مرحومہ کی یاد میں، فاطمہ بنت عبداللہ، ہمایوں اور طلوع اسلام وغیرہ نظمیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ کبھی جناب اسد علامہ اقبال کے شعر مصرع یا مصرع کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ کرکے اسے اپنا لیتے ہیں مثلاً ان کی ایک نظم ہے خطیب سے خطاب جس کا مطلع ہے ؎

ذوق ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے

جناب جمیل نقوی کو یہ نظم اقبال کی اس نظم کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے[۱۴]

ہوس منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من

ان کی ایک نظم کا مطلع ہے ؎

بن گیا دستور اسلامی اب آگے کیا کریں
ہو گئے خوش عارف و عامی اب آگے کیا کریں

ردیف داب آگے کیا کریں، سے ذہن اقبال کے اس مصرع کے پہلے ٹکڑے کی طرف منتقل ہوتا ہے ؎

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

اسی نظم میں حافظ کا ایک مصرع تضمین ہوا ہے ؎

بس کہ شد آئین نو آئینہ تقدیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

---

[۱۳] مرثیہ اقبال۔ ص ۵

[۱۴] ماہ نو۔ جنوری ۱۹۶۰۔ اک شمع رہ گئی تھی .....

جناب اسد تضمین کے باب میں بھی حضرت اقبال سے متمتع ہوتے دکھائی دیتے ہیں ان کے کلام میں جہاں حافظ، صائب، غالب، اکبر وغیرہ کے اشعار کو ضم کرنے کی مثالیں ملتی ہیں وہاں علامہ کے اشعار کی تضمین بھی کی گئی ہے۔ مثلاً ان کی نظم ترکی اور مجلس یورپ، میں اقبال کا یہ شعر تضمین ہوا ہے۔

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!

اسی طرح نظم کلام اقبال کا انگریزی ترجمہ، علامہ کے اس شعر پہ ختم ہوتی ہے ؎

اس اندیشے سے میں ضبطِ فغاں کرتا رہوں کب تک
کہ مُغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

اقبال و اسد کے متذکرہ روابط اور کلام اسد پہ کلام اقبال کی پرتو فگنی کا نظارہ کرنے کے بعد یہ بات بحث طلب نہیں رہ جاتی کہ اسد "اقبالی" ہیں۔ اپنی اقبال مندی کے سبب "اقبالی" تو وہ اس وقت بھی تھے جب شعر میں حضرت اقبال کی پیروی ایک جرم تصور کی جاتی تھی۔ آج جب اقبال سے پرہیز کرنے والے بھی کلام اقبال کی روز افزوں قوتِ تسخیر کے آگے ہتھیار ڈال کر مجبوراً "اقبالی" بن رہے ہیں، کارکردگی کے ساتھ ساتھ تقدم زمانی کے اعتبار سے بھی اسد ملتانی کا حق ہے کہ انہیں دبستانِ اقبال کا عظیم ترین شاعر تسلیم کیا جائے۔

مطبوعہ سہ ماہی سیارہ - اقبال نمبر
شمارہ فروری، مارچ ۱۹۷۸ء

○○○○○
○○○○○

شبنم کا قطرہ

معلوم نہیں یہ سلسلہ اب تک بھی جاری ہے یا نہیں، لیکن بیس پچیس برس پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں ہر سال تقسیم انعامات کے موقع پر ایک انعام اردو میں بہترین نظم لکھنے والے طالب علم کو بھی ملا کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں جب میں جماعت سال اوّل میں تعلیم پاتا تھا کالج کے طلبہ کو حسبِ معمول نظمیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ میں ابھی کالج میں نووارد تھا۔ کالج کی ادبی مجالس میں بھی کوئی ادبی حصہ نہیں لیا تھا اور چند احباب کے سوا کسی کو میرے ذوق شعر و شاعری کا علم نہ تھا۔ انہیں میں سے بعض احباب نے مجھے انعامی مقابلہ کے لیے نظم لکھنے کا مشورہ دیا۔ مگر ان دنوں کالج میں کچھ ایسی مشہور ادبی شخصیتیں موجود تھیں کہ ان کے مقابلہ میں آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک دوست ایسے تھے جن کا مشورہ اصرار کی حد تک پہنچ گیا اور جن کے اصرار میں "خود را پیش کن" سے زیادہ "امتحانِ خویش کن" کا جذبہ کارفرما نظر آتا تھا۔ آخر ان کا اصرار کامیاب ہوا۔ انہی دنوں ایک مضمون ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ اسی کو میں نے "شبنم کا قطرہ" عنوان دیکر نظم میں ڈھال دیا اور یہ نظم کالج کے دفتر میں پہنچا دی۔

کوئی مہینہ بھر کے بعد ایک دن اچانک انہی اصرار کرنے والے دوست نے آکر مبارک باد دی کہ آپ کی نظم اول قرار دی گئی ہے اور اس سال کا انعام آپ کو ملے گا! میں اسے مذاق سمجھا لیکن جب ان کے کہنے پر خود جاکر کالج کے تختۂ اعلانات پر اعلان پڑھا تو مسرت آمیز تعجب ہوا کیونکہ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ کالج کے طلبہ میں تو یہ ایک طے شدہ امر تھا کہ اول انعام بزم سخن کے سیکرٹری کا حصہ ہے جو کالج کے "ملک الشعرا" کہلاتے تھے۔ اس وقت لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت کے مالک تھے اور کئی برس سے متواتر انعام لے رہے تھے۔ اعلان میں درج تھا کہ میری نظم اول اور ان کی نظم دوسرے درجے پر قرار دی گئی ہے۔ فلاں تاریخ کو کالج کا ایک خاص جلسہ منعقد ہوگا جس میں ہم دونوں یہ نظمیں پڑھ کر سنائیں گے۔ اس کامیابی پر میرے احباب کی اور خاص طور پر میری خوشی کا سب سے بڑا باعث یہ تھا کہ انعامی مقابلے کا فیصلہ حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔[1]

---

[1] اس سلسلے میں جناب تصدق حسین خالد [۱۹۰۹ - ۱۹۷۲ء] کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ اپنے مجموعۂ کلام سرودِ لو کے صفحہ 'ح' پر 'کچھ اپنے متعلق' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"گورنمنٹ کالج میں ہر سال بہترین نظم لکھنے والے کو انعام ملتا تھا اور اس موقع پر ایک عظیم الشان تقریب ہوتی۔ ۲۱ - ۱۹۲۰ء میں (پروفیسر) قاضی فضل حق مرحوم کالج کی بزم سخن کے صدر تھے اور میں سیکرٹری۔ کالج کے سب شعرا نے نظمیں لکھ کر مقابلہ کے لیے بھیجیں جو علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں بغرض فیصلہ بھیج دی گئیں۔ لکھنے والوں کے نام نظموں کے نیچے یا کسی اور حصہ میں نہ دیئے گئے۔ چند دنوں کے بعد قاضی صاحب نے مجھے بلا کر فرمایا کہ تمہارے ساتھ تو ظلم ہو گیا ہے۔ میں نے عرض کی وہ کیونکر؟ فرمانے لگے

جس روز جلسہ ہوا میری نظم میرے حوالے کر دی گئی۔ یہ دیکھ کر میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ نظم پر جا بجا اصلاح بھی موجود تھی اس وقت تو میں اس اصلاح کو نہ پوری

بقیہ : حاشیہ

تمہاری نظم پر ڈاکٹر صاحب نے لکھ دیا ہے کہ اگرچہ یہ نظم باقی سب نظموں سے بہتر ہے لیکن اسے انعام نہ دیا جائے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ کسی طالب علم نے کسی اور سے لکھوا کر بھیج دی ہے۔ انعام میرے دوست اسد ملتانی کو ان کی نظم "تاج محل" (سہوِ حافظہ ہے۔ اسد صاحب کی نظم کا عنوان "قطرۂ شبنم" تھا جیسا کہ اسد صاحب نے اپنے مضمون میں بھی ذکر کیا ہے۔ جعفر) پر ملا۔ میری نظم کا عنوان "پیغام سروش" تھا۔ یہ ایک ملی نظم تھی جس میں ڈاکٹر صاحب کے اسلوب کا پورے طور پر اتباع کیا گیا تھا۔ میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ مجھے علامہ اقبال کا ریمارک سن کر رنج کی بجائے بے انتہا مسرت ہوئی ہے۔ قاضی صاحب نے علامہ موصوف سے اس کا ذکر کیا اور جب میں بعد میں کسی موقع پر ان سے ملا تو آپ نے اپنی غلطی پر بہت افسوس ظاہر فرمایا اور کہا کہ مجھے خبر ملی تھی کہ کالج کے طلبہ انعام حاصل کرنے کے لیے اوروں سے نظمیں لکھوا لیتے ہیں اس لیے جب میں نے تمہاری نظم پڑھی تو خیال آیا کہ یہ نظم کسی طالب علم کی نہیں بلکہ کسی پختہ کار سے لکھوائی گئی ہے۔ میں مؤدبانہ آداب بجا لایا، لیکن اس واقعہ کا یہ اثر ضرور ہوا کہ اس کے بعد میں نے کوئی ملّی نظم نہ لکھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسد اب ملّی شاعر ہیں!"

جناب تصدق حسین خالد نے اول انعام کے حصول کے سلسلے میں اپنی ناکامی کی جو توجیہہ فرمائی ہے وہ سر آنکھوں پر۔ لیکن کاش وہ اتنی بات اور بتا دیتے کہ اگر پروفیسر قاضی فضل حق مرحوم سمجھتے تھے کہ خالد صاحب سے ظلم ہو گیا ہے اور انہوں نے حضرت علامہ اقبال سے اس واقعہ کا ذکر بھی کیا تھا تو پھر حضرت علامہ اقبال کو اس خاص صورتحال کے پیش نظر فیصلہ پر نظر ثانی کی درخواست کیوں نہ کی گئی۔ جب کہ متعدد شواہد سے

طرح پڑھ اور نہ اچھی طرح سمجھ سکا۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس جلسے میں مَیں نے کہیں اصل اور کہیں اصلاح کے مطابق نظم پڑھ دی تھی لیکن بعد میں جب غور سے دیکھا تو اصلاح کی اہمیت محسوس ہوئی۔

چند روز کے بعد میں خود حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں وہ انارکلی والے بالاخانہ میں قیام فرما تھے۔ میں جھجکتے جھجکتے اوپر پہنچا۔ انہوں نے پاس کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ خود ایک آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقہ پینے میں مصروف تھے۔ سامنے ان کے ایک ہم عمر بزرگ تشریف رکھتے تھے جو سیالکوٹ کے رہنے والے اور غالباً ان کے ہم جماعت یا بچپن کے دوست تھے۔ ان کے ساتھ وہ اپنے طالب علمی کے زمانہ کے واقعات کی یاد تازہ کر رہے تھے۔

بقیہ : حاشیہ

ظاہر ہے کہ پروفیسر قاضی فضل حق کے حضرت علامہ سے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ جناب اسد ملتانی نے لکھا ہے کہ اعلان میں درج تھا کہ میری نظم اوّل اور ان (تصدق حسین خالد) کی نظم دوسرے درجے پر قرار دی گئی ہے" اگر جناب خالد کی نظم کے بارے میں حضرت علامہ کا یہ تاثر تھا کہ وہ کسی طالب علم کی کہی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ کسی پختہ کار شاعر سے لکھوائی گئی ہے اور اسی لیے اسے اول انعام کا مستحق نہیں سمجھا گیا تھا تو یہ اعتراض اس نظم کو دوم انعام کا مستحق قرار دینے کی صورت میں کیسے رفع ہو گیا؟

جناب خالد نے اپنی نظم پر حضرت علامہ اقبال کے جس تحریری نوٹ کا حوالہ دیا ہے، افسوس وہ بھی انہوں نے محفوظ نہ رکھا اور اگر محفوظ رکھا تو اسے شائع نہ کرایا حالانکہ انعام یافتہ طالب علم شعرا کو، جیسا کہ جناب اسد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی نظمیں حضرت علامہ کے فیصلے کے بعد واپس مل گئی تھیں اور انہوں نے وہی نظمیں بعد میں ہونے والے مشاعرہ میں پڑھی تھیں۔ اگر حضرت علامہ کا متذکرہ بالا نوٹ محفوظ ہوتا تو جناب تصدق حسین خالد کا بیان یقیناً زیادہ باوثوق ہوتا۔ (جعفر)

کہ سیالکوٹ میں وہ کس طرح مدرسہ کے اوقات کے بعد مساجد و مکاتب میں مختلف مولوی صاحبان کی خدمت میں حاضر ہو کر فارسی پڑھا کرتے تھے۔ ایک استاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا (اپنا یا شاید ان کا بتایا ہوا) یہ شعر اب تک نہیں بھولتا ؎

از قدِ رعنائے او من دردمند افتادہ ام
دوستاں رحمے کہ از بامِ بلند افتادہ ام

اس انداز کے دلچسپ واقعات کے بعد فرمانے لگے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبالؔ کو فارسی کیونکر آ گئی۔ جب کہ اس نے اسکول یا کالج میں یہ زبان نہیں پڑھی۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لیے سکول ہی کے زمانے میں کس قدر محنت اٹھائی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا۔

فارسی زبان کے سلسلے میں مولانا گرامی (مرحوم[1]) کا ذکر آ گیا۔ ان کے غیر معمولی حافظہ کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ کسی کو اشعار غزلیں یا نظمیں یاد ہوں گی مگر مولانا کو مثنویاں تک مسلسل یاد ہیں۔ وہ اس وقت اسی کمرے کے ایک گوشے میں پلنگ پر دراز تھے۔ فرمایا لیجیے: ابھی ان کے حافظے کا کرشمہ دیکھیے۔ یہ کہہ کر مولانا کو آواز دی۔ وہ اٹھ بیٹھے۔ کہا کہ مولانا! حضرت نظامی[2] نے وہ کیا فرمایا ہے ؎

زگردِ بیاباں بیابان گرد

بس اس مصرع کا سننا تھا کہ مولانا گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا کر جھومنے لگے اور کہنے لگے۔ اللہ اللہ! اللہ اللہ! اس کے بعد ایک دو بار اس مصرع کو دہرایا اور پھر وہیں سے مثنوی شروع کر دی۔ مزے لے لے کر شعر پر شعر

---

[1] مولانا غلام قادر گرامی جالندھری م ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء
[2] حکیم ابو محمد الیاس نظامی گنجوی ۵۳۵ھ تا ۵۹۹ھ

پڑھتے گئے۔ میں نے مولانا گرامی کو پہلی اور آخری بار جبھی دیکھا۔ ان کا منڈا ہوا سر۔ اٹھی ہوئی انگلیاں نیم وجد کا عالم۔ جھوم جھوم کر زور دار اور پُر جذب آواز کے ساتھ شعر پڑھنا۔ یہ تمام منظر اب تک میرے تصور پر نقش ہے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا اور شاید بہت دیر جاری رہتا لیکن آخر حضرت علامہ نے نہایت حسنِ اسلوب سے موضوع بدل کر گفتگو کا رخ کسی اور طرف پھیر دیا۔

کچھ دیر بعد میری طرف مستفسرانہ انداز میں توجہ فرمائی تو میں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ اصلاح شدہ نظم اُن کے پیش کر کے ان کی توجۂ خاص کا شکریہ ادا کیا۔ دیکھ کر فرمایا کہ ہاں یہ نظم مجھے پسند آئی تھی۔ اس خیال سے کہ یہ کہیں شائع ہو گی۔ مَیں نے جہاں جہاں ضروری سمجھا اصلاح کر دی اس کے بعد کچھ وقت اصلاح کے متعلق باتیں ہوئیں۔ چونکہ دیر بہت ہو گئی تھی آخر مَیں نے اجازت طلب کی اور اس محفلِ خاص سے بادلِ ناخواستہ رخصت ہوا۔

یہ تھی حضرت علامہ کی خدمت میں میری پہلی حاضری اور یہ تھی وہ صورت حالات جس کے ماتحت میری نظم کو حضرت علامہ کے قلم سے اصلاح کا شرف حاصل ہوا۔ فنی حیثیت سے یہ اصلاح شاید کچھ زیادہ اہم نہ سمجھی جائے کیونکہ نظم بالکل مبتدیانہ ہے۔ اس لیے زیادہ تر اس میں غلطیوں کو صحیح اور سست بندشوں کو درست کرنے ہی کی ضرورت تھی، لیکن چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اصلاح میں نوکِ قلم کی استادانہ جنبش صاف نمایاں ہے۔ مثلاً

ے اس طرح پھرتا پھراتا جستجوئے یار میں
تھک کے آخر گر پڑا ہوں گوشۂ گلزار میں

ع کیا کہوں پوشیدہ تھی فطرت میں از خود رفتگی

ع کوہ میں بھی دل نہ بہلا ہمرہِ دریا ہوا

ان مصرعوں میں تھوڑی سی تبدیلی سے اشعار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا گیا ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر نظم کا پہلا شعر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کیونکہ اس میں حضرت علامہ نے میرے دو مصرعوں کو ایک مصرع میں سمو کر اور دوسرا مصرع اپنی طرف سے بڑھا کر نظم کی تمہید کو مکمل کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں نظم کے ابتدائی چند اشعار کا قلمزد ہو جانا بھی حضرت علامہ کے خاص نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُن دنوں تو مجھے بھی تعجب اور افسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے ایسی عمدہ تشبیہات کو بحال نہ رہنے دیا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اصلاح کی مصلحت واضح ہوتی گئی اور آخر صاف محسوس ہونے لگا کہ حضرت علامہ کے نزدیک بے جان فن کاری اور مصنوعی شاعری کس قدر بیکار اور بے معنی چیز ہے۔

بہرصورت فن کے لحاظ سے اس اصلاح کی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ بھی لگایا جائے جہاں تک مجھے علم ہے حضرتِ علامہ نے کبھی کسی کی نظم کی اصلاح اپنے قلم سے نہیں فرمائی۔ اگر یہ درست ہے تو پھر اس حیثیت سے یہ اصلاح یقیناً اہلِ ذوق کے لیے نوادرِ ادبیہ میں سے ہے اور میرے لیے بجا طور پر باعثِ فخر و مباہات۔

نئی دہلی

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

اسدؔ ملتانی

قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں نظم "شبنم کا قطرہ" کا قبل از اصلاح کا متن پیش کیا جاتا ہے اور اس کے مختلف شعروں اور مصرعوں پر حضرت علامہ اقبال کی اصلاح بھی درج کی جاتی ہے۔

شبنم کا قطرہ

شاہدِ لالہ کا اک زینت فزا زیور ہوں میں
نازنینِ گُل کے نازک کان کا گوہر ہوں میں
دیدۂ نرگس میں میں اک اشک فرحت فال ہوں
روئے زیبائے سمن پر جانشینِ خال ہوں
بوند ہوں آبِ عنب کی میں بجامِ موتیا
لب پہ خضرِ سبزہ کے ہوں قطرۂ آبِ بقا
برگِ گلبن کی صدف میں گوہرِ نایاب ہوں
جھومتی ڈالی پہ مثلِ قطرۂ سیماب ہوں
اس طرح جلوہ نما ہوتا ہوں نوکِ خار پر
جیسے آویزاں سرِ منصور ہو وے دار پر
دیکھنے کو اک ذرا سا قطرۂ بے رنگ ہوں
مختلف رنگوں میں لیکن قلزمِ نیرنگ ہوں
پر نہیں ہے چین میرے قلبِ مضطر کے لیے
میں بنا ہوں چرخ کی مانند چکّر کے لیے
پھر رہا ہوں دلبروں کی آنکھ کے تل کی طرح
مضطر و بے تاب ہوں عشاق کے دل کی طرح
گردشِ ہفت آسماں پنہاں ہے میرے سینے میں
ہے نہاں رازِ حیاتِ روح میرے جینے میں

اک ذرا سنئے مری آوارگی کی داستاں
میں کہاں تھا کس لیے اور کس طرح پہنچا یہاں؟

پہلے پہلے تھا ٹھکانہ اک سمندر میں مرا
تھا نہایت خرم و شاداں دل اس گھر میں مرا
یاد ہیں لہریں جو سطحِ آب پر آوارہ تھیں
ہاں یہی لہریں یہی موجیں مرا گہوارہ تھیں
یاد آتی ہیں مجھے رہ رہ کے وہ آزادیاں
جن کی خاطر اب ترستا ہے دل ناشادیاں
گاہ سونے کیلئے تہ میں چلا جاتا تھا میں
سطح پر بہرِ تماشا گاہ آجاتا تھا میں
اتفاقاً ایک دن آیا جو سطحِ آب پر
جا پڑی مری نگاہ خورشید عالم تاب پر
دیکھ کر اس شعلہ رُو کو آگ سی دل میں لگی
آہ پھر کیا ہوتا میں تھا اور تھی از خود رفتگی
دل مرا تیرِ نگاہِ مہر نے گھائل کیا
اور وفورِ شوق نے پرواز پر مائل کیا
چھوڑی شکلِ اشک اور آہِ رسا بنکر اڑا
میں ہوائے وصل جاناں میں ہوا بنکر اڑا

لاکھوں لٹکے تھے مری خاطر شعاعوں کے کمند
کرۂ خاکی سے لے کر تا بہ آں بامِ بلند

میں بھی چڑھتا رہ گیا ان پر سحر سے شام تک
پر نہ پہنچا ہائے قسمت دلربا کی بام تک

شام ہونے سے تو بس میرا مقدر سو گیا
بخت دنیا کی طرح تاریک منظر ہو گیا
جس سے ملنے کے لیے میں ڈھونڈتا تھا کوئی راہ
اس کے نظارہ سے بھی آنکھیں ہوئیں محروم آہ
ابر کے ہمراہ سرگرداں رہا میں رات بھر،
تارے دیکھے چاند دیکھا پر نہ آیا وہ نظر،
میں جو تھا ناکام بھی، مایوس بھی، بے صبر بھی،
میرے حالِ زار پر رونے لگا، خود ابر بھی
میں بھی ساتھ اس ابر کے اشکِ چکاں بنکر گرا
اور گرا کس چیز پر؟ میں اک پہاڑی پر گرا
اس پہاڑی سے میں بہہ کر ہمرہِ دریا ہوا
جوشِ وحشت میں روانہ جانبِ صحرا ہوا

جب مرا بے مہر دلبر پھر نظر آیا مجھے
اور کمندِ حسنِ دل آویز سے کھینچا مجھے

آب دریا سے مجھے فوراً جدا ہونا پڑا
پھر سوارِ توسنِ بادِ صبا ہونا پڑا
اس طرح سے پھرتا پھرتا میں تلاشِ یار میں
سرد دل ہو کر گرا آخر یہاں گلزار میں

ہوں وہی قطرہ جو تھا اک دن وہ بحرِ بیکراں
ہوں وہی قطرہ جو تھا ہمراہِ دریائے رواں
ہوں وہی قطرہ کہ جو تھا ابرِ گوہر بار میں
ہوں وہی قطرہ جو برسا تھا کبھی کہسار میں
میں وہی قطرہ ہوں جو کالی گھٹا کے ساتھ تھا
میں وہی قطرہ ہوں جو اک دن ہوا کیساتھ تھا
بات یہ ہے اہلِ دنیا جانتے ہیں کم مجھے
یہ سمجھتے ہیں فقط اک قطرۂ شبنم مجھے
قطرۂ ناچیز ہوں لیکن جہاں دیدہ ہوں میں
تجربہ کارِ انقلابِ آسماں دیدہ ہوں میں
میری ہستی ہستیٔ انسان سے کچھ کم نہیں
غافل انساں لیکن ان اسرار سے محرم نہیں
محرمِ رازِ بلندی واقفِ پستی ہوں میں
بہرِ انساں رہنمائے منزلِ ہستی ہوں میں
ہاں مجسّم تجربہ ہوں اور سراپا ہوش ہوں
ہوں ذرا سا قطرہ لیکن بحر در آغوش ہوں

(۱۲ر فروری ۱۹۲۱ر کو لکھی گئی)

حضرت علامہ اقبالؒ نے نظم کی اصلاح کرتے ہوئے پہلے پانچ تمہیدی اشعار حذف کر دیئے اور چھٹے شعر کو اصلاح دے کر نظم کا آغاز یوں فرمایا ؎

قطرۂ بے رنگ ہوں یا قلزمِ نیرنگ ہوں،
سننے والے سن کہ میں بھی اک خموش آہنگ ہوں،

اس کے بعد مختلف مصرعوں یا اشعار پر اصلاحیں درج ذیل ہیں،

اصل :- پر نہیں ہے چین میرے قلب مضطر کے لیے

اصلاح :- وقف بے تابی ہے میری جان مضطر کے لیے

یہ شعر حذف کر دیا گیا ہے، پھر رہا ہوں دلبروں کی ..... الخ

اصل :- ہے نہاں رازِ حیات روح میرے جینے میں

اصلاح :- زندگی کا راز پوشیدہ ہے میرے جینے میں

اصل :- اک ذرا سنئے مری آوارگی کی داستاں

اصلاح :- سن ذرا غافل مری آوارگی کی داستاں،

اصل :- آہ پھر کیا ہوتا میں تھا اور تھی از خود رفتگی

اصلاح :- کیا کہوں پوشیدہ تھی فطرت میں از خود رفتگی

یہ دو شعر حذف کر دیئے گئے ہیں ؎

لاکھوں لٹکے تھے مری خاطر ..... الخ میں بھی چڑھتا رہ گیا ..... الخ

اصل :- شام ہونے سے تو بس میرا مقدر سو گیا
بخت دنیا کی طرح تاریک منظر ہو گیا

اصلاح :- شام آئی جس گھڑی میرا مقدر سو گیا
میری قسمت کیطرح تاریک منظر ہو گیا

اصل :- میں بھی ساتھ اس ابر کے اشکِ چکاں بنکر گرا
اور گرا کس چیز پر؟ میں اک پہاڑی پر گرا

اصلاح :- مل گیا بوندوں میں اشک مضطرب بن کر گرا
رفعتِ گردوں سے آخر اک پہاڑی پر گرا

اصل :- اس پہاڑی سے میں بہہ کر ہمرہِ دریا ہوا

اصلاح:- کوہ میں بھی دل نہ بہلا ہمرہِ دریا ہوا

اصل:- اس طرح سے پھرتا پھرتا میں تلاشِ یار میں
سرد دل ہو کر گرا آخر یہاں گلزار میں

اصلاح:- اس طرح پھرتا پھراتا جستجوئے یار میں
تھک کے آخر گر پڑا ہوں گوشۂ گلزار میں

اصل: ہوں وہی قطرہ جو تھا اک دن وہ بحرِ بیکراں

اصلاح: ہوں وہی قطرہ جو تھا اک دن سمندر میں نہاں

Scanned with CamScanner

فیضانِ اقبال

کچھ دن ہوئے میں اپنے متفرق مسودات کا جائزہ لے رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ان میں ایک ایسی تحریر مل گئی جس میں حضرت علامہ اقبال سے ایک ملاقات کا مفصل حال درج تھا۔ اسے دیکھ کر اس وقت کی یاد تازہ ہو گئی جب مارچ ۱۹۳۳ء میں

لہ یہ مضمون پہلی بار ماہنامہ "طلوع اسلام" کے شمارہ مئی ۱۹۴۱ء میں چھپا تھا۔ یہی مضمون جناب اختر راہی نے ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر "بزم اقبال" کے سہ ماہی مجلہ "اقبال" کے اپریل ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں شائع کرایا تھا۔ جناب اختر راہی نے مضمون کا عنوان بھی بدل دیا تھا اور اس کا نیا عنوان "اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق" قائم کیا تھا۔ موصوف نے زیر نظر مضمون کے متعلق جناب اسد کا تمہیدی نوٹ بھی حذف کر دیا تھا اور متن میں جابجا "اصلاحیں" بھی دی تھیں۔ اب یہ مضمون "طلوع اسلام" کے محولہ بالا متن کے مطابق شائع کیا جا رہا ہے۔ البتہ حواشی میں جو اضافے جناب اختر راہی نے کئے تھے، ان سے بعض مقامات پر میں نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کے لیے میں جناب راہی کا ممنون ہوں۔ (جعفر)

وہ جامعہ ملیہ میں غازی رؤف پاشا[۲] کی ایک تقریر کے موقع پر جلسہ کی صدارت کرنے کیلئے دہلی تشریف لائے[۳] اور ڈاکٹر انصاری مرحوم[۴] کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ میں محترمی

---

[۲] غازی رؤف پاشا کا اصل نام رؤف بے تھا۔ وہ ۱۸۷۱ء میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مظفر پاشا عثمانی بحریہ کے رکن تھے۔ چنانچہ رؤف بے کو بھی بحریات کی تعلیم دلائی گئی۔ تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد آپ جہاز "حمیدیہ" پر متعین ہوئے۔ جنگ بلقان کے دنوں میں آپ جہاز حمیدیہ کے سپہ سالار تھے اور دورانِ جنگ میں انہوں نے اعلیٰ فوجی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کمتر وسائل کے باوجود یونان کی تباہ کن کشتیوں پر حملہ کیا اور انہیں درہ دانیال سے مار بھگایا۔ "حمیدیہ" نے دشمنوں کو ہراساں کر دیا تھا۔ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کے قبضہ کے بعد رؤف بے مجلسِ ملّیہ (انگورہ) کے قیام میں شریک ہوئے اور مجلس ملّیہ کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۲ء کو حکومتِ ملیہ نے انہیں "پاشا" کا خطاب دیا۔ ترکی میں قومی حکومت بننے کے بعد بعض امور میں مصطفےٰ کمال (۱۸۸۱ - ۱۹۳۸ء) سے ان کا اختلاف ہو گیا اور انہوں نے ملک چھوڑ کر فرانس میں سکونت اختیار کر لی۔ اوائل ۱۹۳۳ء میں آپ ہندوستان آئے اور جامعہ ملّیہ دہلی میں توسیعی لیکچر دیئے۔

مصطفےٰ کمال نے جلاوطن ترک رہنماؤں کو وطن واپس آنے کی دعوت دی۔ تو رؤف پاشا بھی وطن گئے اور وزارت بحریہ کے نگران مقرر ہوئے۔ بعد ازاں خرابیٔ صحت کی بنا پر اس منصب سے علیحدہ ہو گئے اور مجلس ملیہ کے رکن منتخب ہوئے۔

(ملخص از ترکانِ احرار طبع ہشتم۔ عبدالمجید عتیقی)

[۳] حضرت علامہ اقبال ۱۸ مارچ کی صبح کو دہلی پہنچے اور غازی رؤف پاشا کے لیکچروں کے سلسلے میں اٹھارہ اور بیس مارچ کو منعقد ہونے والے دو جلسوں کی صدارت فرمائی۔

جناب امداد حسین صاحب اخگر مراد آبادی[۵] اور عزیز دوست مولوی محمد احمد ندوی

بقیہ حاشیہ نمبر ۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیں مکتوبات اقبال مرتبہ نذیر نیازی ایڈیشن ۱۹۵۷ء ص ۹۶ تا ۱۰۱۔

۴۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰-۱۹۳۶ء) مسلمانوں کے معروف قومی رہنما تھے۔ وہ ضلع غازی پور کے ایک قصبہ یوسف پور کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے بنارس سے ایف اے اور ریاستی کالج حیدر آباد دکن سے بی۔ اے کیا۔ لندن سے ایم۔ کے سی اور آر سی پی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وہیں ایک بڑے ہسپتال میں ہاؤس سرجن ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں انگلستان سے واپس آکر چاندنی چوک دہلی میں اپنا دواخانہ قائم کیا۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے ایک طبی وفد تشکیل دیا جو اہنی کی سربراہی میں بلقان کی جنگوں میں ترکوں کی امداد کے لیے ترکی گیا سید سلیمان ندوی (۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء - ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء) نے لکھا ہے کہ جب یہ وفد رخصت ہونے لگا تو علامہ شبلی نعمانی نے فرطِ محبت و عقیدت میں ڈاکٹر انصاری کے بوٹ چوم لیے۔ ڈاکٹر انصاری نے مسلم لیگ کو منظم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا اور اس کے ۱۹۲۰ء کے اجلاس کی صدارت کی لیکن بعد میں کانگرس کی طرف ان کا جھکاؤ بڑھتا گیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۲۷ء کے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت بھی کی۔ تحریک عدم تعاون میں بھی انہوں نے گاندھی کا ساتھ دیا اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں دو بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ گاندھی ٹوپی اور کھدر کے کرتے کے ساتھ کھنچوائی ہوئی ڈاکٹر انصاری کی تصویر دیکھ کر حضرت علامہ اقبال نے ۱۹۳۳ء میں فرمایا تھا پور (بیچارہ) انصاری"

i A DICTIONARY OF INDIAN HISTORY S. BHATTACHARYA

ii۔ یادِ رفتگان۔ از سید سلیمان ندوی

(جو ۱۹۳۶ء میں عین جوانی میں فوت ہو گئے) کے ہمراہ ان سے ملنے گیا۔ ۹ بجے صبح سے کوئی بارہ بجے تک نہایت دلچسپ علمی صحبت قائم رہی۔ اُسی روز وہ سر عبداللہ سہروردی مرحوم[۶] کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ جب ادھر سے ٹیلیفون پر ٹیلیفون

بقیہ حاشیہ نمبر ۴ - iii مکتوبات اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی۔

۱۷ - اردو انسائیکلو پیڈیا - فیروز سنز

[۵] امداد حسین اخگر مراد آبادی خمخانۂ جاوید مرتبہ لالہ سری رام کی جلد اوّل پہلی بار ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اخگر صاحب کے بارے میں یہ معلومات ملتی ہیں "منشی امداد حسین صاحب باشندۂ مراد آباد۔ ملازم گورنمنٹ پریس شملہ۔ شبیر علی خاں تنہا کے شاگرد ہیں۔ طبیعت موزوں پائی ہے۔ شعر بُرا نہیں کہتے۔ اکثر شعر و سخن کا مشغلہ اور صحبت رہتی ہے کبھی کبھی شملے پر مشاعرہ بھی کیا کرتے ہیں۔ آجکل نیچرل شاعری کی طرف مائل ہیں۔ عمر تقریباً تیس سال ہو گی۔" اپریل ۱۹۳۹ء کے "طلوع اسلام" میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ رباعیاتِ اخگر، کے چھپنے کا اشتہار بھی نکلا تھا۔ افسوس یہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔ البتہ طلوع اسلام کے ۳۹-۱۹۳۸ء کے مختلف شماروں میں حضرت اخگر کی چند رباعیات شائع ہوئی ہیں۔ بطور نمونۂ کلام ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے ؎

پھر عدل پہ مفتوں تری دنیا ہو جائے — پھر موتیوں سے پُر ترا دریا ہو جائے
ہٹلر بھی ہیں بہتیرے مسولینی بھی — اللہ عمرؓ بھی کوئی پیدا ہو جائے

ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ کے شمارہ جولائی ۱۹۴۲ء کے ایک نوٹ کے مطابق اخگر صاحب نے اپنے وطن مالوف مراد آباد میں دسمبر ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

[۶] سر عبداللہ المامون سہروردی (۱۸۸۱ - ۱۹۳۵ء)
ڈھاکہ مدرسہ ڈھاکہ اور کنگز کالج لندن میں تعلیم پائی۔

آنے لگا تو بادلِ نخواستہ یہ مجلس ختم کرنی پڑی ورنہ جس توجہ سے وہ ہم سے گفتگو فرما رہے تھے اس کے پیش نظر ہم ابھی کچھ دیر اور ان کے ارشادات سے فیض یاب ہوتے رہتے۔

میں نے ملاقات کا حال غالباً اسی روز لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن افسوس کہ ناتمام رہ گیا اور کچھ عرصے کے بعد مسودہ ایسے کاغذات کے ساتھ خلط ملط ہو گیا کہ پھر اس کا خیال تک نہ رہا۔

اس ملاقات میں کچھ تو اہم علمی مسائل زیر بحث آئے اور کچھ عام باتیں ہوئیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں، جن کا بعض حضرات نے اپنی ملاقاتوں کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ لیکن جی نہیں چاہتا کہ اس کے سبب میں اپنے نامکمل بیان میں بھی قطع و برید کر دوں۔ لہٰذا بے کم و کاست پیش کئے دیتا ہوں۔

حضرت علامہ سے بعد دوسری ملاقاتوں کے بھی کچھ حالات حافظے میں محفوظ ہیں اگر کبھی توفیق ہوئی تو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔

اسد

پین اسلامک سوسائٹی لندن کے بانی سیکرٹری تھے۔

۱۹۱۰ سے ۱۹۲۶ء تک بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔

۱۹۲۳ سے ۱۹۲۶ء تک اسی کونسل کے ڈپٹی پریذیڈنٹ بھی رہے۔

۱۹۲۴ء میں خلافت کمیٹی کلکتہ کے صدر تھے۔

۱۹۲۶ء میں انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے۔

کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے اور اسی یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔

۱۳ جنوری ۱۹۳۵ء کو وفات پائی۔ (پروفیسر احمد سعید کے زیر ترتیب سوانحی لغت ماڈرن مسلم انڈیا۔ اے بیاگرافیکل ڈکشنری" سے ماخوذ)

۱۴ر مارچ ۱۹۳۳ء

آج ۹ بجے صبح جناب اخگر مراد آبادی، مولانا محمد احمد ندوی اور میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دارالسلام واقع دریا گنج میں ڈاکٹر سر اقبال سے ملنے گئے۔

اخگر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شان میں ایک انگریزی نظم لکھی تھی جو ایک روز پہلے مولانا شفیع داؤدی کے حوالے کر دی گئی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کل شام آپ کی نظم مولانا شفیع داؤدی نے مجھے دی۔ ابھی تک میری جیب میں ہے دیکھ نہیں سکا۔

زبان

اخگر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں، انگریزی ہماری زبان نہیں ممکن ہے اس میں غلطیاں ہوں۔ مگر اصل مقصد ان جذبات کا اظہار ہے جو آپ کی نسبت میرے دل میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے کہ مولانا! زبان کی کچھ پروا نہیں، زبان تو اہلِ فکر خود پیدا کرتے ہیں۔ اہلِ زبان کے متعلق تو اتنا سمجھتا ہوں کہ انہیں چکی چولہے کے الفاظ کافی تعداد میں معلوم ہوتے ہیں ورنہ علمی خیالات کے اظہار کے لیے اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو خیالات کے مطابق الفاظ تراشنے پڑتے ہیں۔ مرزا بیدل[1] کی فارسی کو اہلِ زبان نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ وہ محاورات تک نئے پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ان کا مصرع ہے:

بر ہر قدمے خرام می کاشت

---

[1] مرزا عبدالقادر بیدل پیدائش ۱۰۵۴ھ بمقام پٹنہ۔ وفات ۱۱۳۳ بمقام دہلی۔ ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں "علامہ اقبال مرحوم کی مجلس میں ایک بار بیدل کے محاورہ "خرام کاشتن" کا ذکر چھڑ گیا انہوں نے فرمایا کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کا فلسفۂ حیات حرکی (DYNAMIC)

"خرام کاشتن" فارسی میں کوئی محاورہ نہیں مگر جو خیال بیدل کے ذہن میں تھا۔ اس کو ادا کرنے کے لیے لازمی تھا کہ یہی الفاظ استعمال کیے جاتے، کیونکہ ان کے علاوہ اور کوئی الفاظ فارسی زبان میں اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جس طرح مذہب میں تقلید سے کام لیا جاتا ہے، اسی طرح ادبیات میں بھی تقلید کی جاتی ہے۔ مانا کہ محاورے میں کسی حد تک اہلِ زبان کی پیروی مناسب ہے مگر لطف تو یہ ہے کہ ترکیب اور استعارے میں بھی اساتذہ کی سند طلب کی جاتی ہے۔ اگر یہ خیال رکھا جائے تو جدت و اختراع کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔

وضعِ الفاظ

میں نے کہا کہ بالعموم جدّتِ ترکیب و استعارہ پر اعتراض نہیں ہوتا بلکہ اس امر پر کہ ایک غیر اہلِ زبان اظہارِ خیال کے لیے کوئی نیا لفظ یا محاورہ پیدا کرتا ہے، حالانکہ اصل زبان میں اس کے لیے پہلے بھی لفظ یا محاورہ موجود ہوتا ہے۔ کہنے لگے ہاں، جب زبان میں اچھا لفظ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے موجود ہو تو نیا لفظ تراشنا غیر ضروری ہے، لیکن اگر کوئی ایسا کر بھی دے اور لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں بھی نہ ہو تو میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ البتہ یہ شرط ہے کہ وہ نیا لفظ کسی ہم جنس زبان کا ہو جیسے اردو میں عربی، فارسی، پنجابی وغیرہ کا لفظ کھپ سکتا ہے مگر لاطینی وغیرہ کا نہیں۔

اقبال کی فارسی

میں نے کہا "آپ نے فرمایا ہے کہ لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں نہ ہو۔ کیا سماعت کی اس تربیت کے لیے زبان کے بکثرت مطالعے کی ضرورت نہیں ہوتی؟" فرمایا "میں اس صفت کو ایک عطیۂ قدرت سمجھتا ہوں۔ فارسی میں میری رسمی تعلیم صرف میٹرک تک ہے یا اس سے پہلے کچھ مکتبوں

بقیہ حاشیہ نمبر ۷ ۔ ہے اور ان کے مقابلے میں مرزا غالب کا مائل بہ سکون دار مغان ایران۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی ص ۱۶۷)

میں پڑھی تھی۔ مگر اب جو میں فارسی میں لکھتا ہوں اور کسی محاورے کے متعلق شک گزرتا ہے اور اس وقت کوئی لغت یا کتاب پاس نہیں ہوتی تو اپنے کانوں پر بھروسہ کرتا ہوں۔ جو الفاظ کانوں کو بھلے معلوم ہوں وہی رکھ دیتا ہوں اور ہمیشہ دیکھا ہے کہ بعد میں وہی محاورات درست ثابت ہوئے ہیں۔"

اس موقع پر اخگر صاحب نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ کے فارسی کلام پر بھی کبھی اہلِ زبان نے کچھ رائے ظاہر کی ہے؟ بولے کہ اعتراض کرتے ہونگے لیکن مجھ تک کبھی نہیں پہنچے۔ البتہ بعض اہلِ زبان سے تعریف سننے میں آئی ہے۔

میں نے کہا کہ امیر خسرو[۸] پر بھی اہلِ فارس نے یہی اعتراض کیا ہے کہ وہ فارسی میں ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں مثلاً:

ع: عالم بہ منت یک طرف، آں شوخ تنہا یک طرف

میں "منت" کا لفظ ان معنوں میں نہیں جن میں یہ فارسی زبان میں مستعمل ہے بولے "ہاں! مگر یہ بات بھی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی لفظ ہندوستان اور ایران میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے لفظ "تنخواہ" سے ہم کیا مراد لیتے ہیں اور وہ کیا۔"

اُردو میں پنجابی

اسی سلسلے میں فرمایا "میرا ہمیشہ ایسا خیال رہا ہے کہ پنجاب میں طلبا کے لیے جو اردو کورس ہوں، ان میں حسب ضرورت پنجابی کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ مثلاً مولانا آزاد[۹] نے اپنے قاعدے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ "لیزم ہلاؤ"[۱۰]، دہلی میں تو یہ لفظ بچے بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں مگر پنجاب

---

[۸] مشہور مورخ و شاعر (۶۰۵ھ - ذی قعدہ ۷۲۵ھ)

[۹] مولانا محمد حسین آزاد (م ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء / ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ)

[۱۰] مگدر ہلاؤ

میں بچے تو کیا سمجھیں گے، استاد بھی اس کے معنی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس کے بجائے کوئی ایسا نام استعمال ہوتا جو اردو کا نہ سہی لیکن پنجاب میں عام ہوتا تو یقیناً زیادہ مفید رہتا اسی امر کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے پنجاب میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ زراعت کی کتابوں میں بالخصوص پنجابی کے الفاظ بے تکلف استعمال کئے جائیں۔"

مغرب کی تقلید

میں نے سوال کیا کہ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ہمیں مغربی تہذیب کی نقل نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ اس سے اس کی فضیلت کا عملی اقرار ہوتا ہے۔ جس کے ہم اصولاً خلاف ہیں۔ ادھر ہم کہتے ہیں کہ مغربی علوم و فنون، تہذیب و تمدن کی بنیاد ہم نے رکھی۔ گویا ہم تمدن و ترقی کو ایک خاص مقام پر پہنچا کر ٹھہر گئے۔ اہل مغرب نے وہیں سے لے کر اسے آگے ترقی دی۔ اب چند صدیوں کے بعد ہم جو جاگے تو اہل مغرب کو کہیں سے کہیں پہنچا ہوا پایا۔ کیا اس وقت ہمیں اپنی قوتِ تخلیق سے کام لے کر اس مقام سے اپنی ترقی کی منزل شروع کرنی چاہیئے جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا یا وہاں سے جہاں اسے اہلِ مغرب نے اس وقت پہنچا رکھا ہے؟ کیا مناسب نہ ہوگا کہ پہلے وہ سب کچھ حاصل کر لیں جو اہلِ مغرب معلوم کر چکے ہیں اور پھر اپنی قوتِ تخلیق کو بروئے کار لا کر آگے ترقی کریں؟ میرا خیال ہے کہ ترک اس وقت اسی چیز پر عمل کر رہے ہیں۔

ترکوں کا رویہ: فرمایا کہ نقل اور اخذ میں بہت فرق ہے۔ ترک نقل کر رہے ہیں، نہ کہ اخذ۔ نقل سے قوتِ تخلیق کمزور ہو جاتی ہے مگر اخذ ترقی کے لیے لازمی ہے۔ مغرب نے جو نئی تخلیقات اور ایجادات کی ہیں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اُن کو فوراً اخذ کر کے اپنی مزید ترقی کی بنیاد رکھیں۔ ایک یہ امر بھی مدِنظر رہے کہ تقلید اور نقالی علوم سائنس میں مذموم نہیں بلکہ ضروری ہے، لیکن

مذہب، اخلاق اور تمدن میں یہ زہر کا حکم رکھتی ہے۔ مثلاً ترکوں کو دیکھیے، انہوں نے HAT (ہیٹ) کو علامت ترقی سمجھ لیا ہے، حالانکہ اصل چیز جو لازمۂ ترقی ہے وہ ہیٹ کے نیچے ہے۔

میں نے غازی رؤف بے اور ترکوں کے متعلق دریافت کیا تو بولے کہ غازی رؤف بے، مصطفےٰ کمال سے اختلاف کے باعث مدت سے فرانس میں رہتے ہیں۔ مصطفےٰ کمال انکو بارہا سمجھتے ترکی آنے کی دعوت دے چکے ہیں مگر یہ نہیں جاتے۔ ایک تو انہیں اعتماد نہیں۔ دوسرے اپنا وہاں جانا بے سود سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ترکی مجلسِ قومی میں حکومت کی مخالف جماعت کا کوئی وجود نہیں اور کوئی شخص مصطفےٰ کمال کے خیالات کے برخلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔

ترکی کی موجودہ حالت کے متعلق فرمایا کہ میں فوزی پاشا اور منیر بے ایسے بڑے بڑے آدمیوں سے ملا اور ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ترک مصطفےٰ کمال کی بدعات سے خوش نہیں ہیں۔ بلا مبالغہ تقریباً ۹۷ فی صد لوگ مصطفےٰ کمال کے مخالف ہیں۔ ایک آدھ دفعہ اس پر قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں اور کچھ زیادہ بعید نہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ترک زیادہ سے زیادہ اس کی زندگی تک اس کے استبداد کو ناچار گوارا کر لیں گے۔ اس سے زیادہ دیر تک ہرگز نہیں۔ ردعمل ابھی سے شروع ہو گیا ہے[۱۱] ترک نوجوان اسے سلطان عبدالمجید[۱۲] سے بھی زیادہ مستبد سمجھتے ہیں۔ صرف اس کی

---

[۱۱]۔ ترکوں کے جدید ذہنی رجحانات کے لیے ملاحظہ ہو ترکی قدیم و جدید (روداد سفر) خلیل حامدی۔

[۱۲]۔ سلطان عبدالمجید (م ۲۵ جون ۱۸۶۱ء) کو اصلاحات سے بہت دلچسپی تھی اور انہوں نے بہت سے یورپین طور طریقے رواج دیئے تھے۔ سلطان عبدالمجید کے آخری دورِ حکومت میں مختلف جنگوں خصوصاً جنگ کریمیا کی وجہ سے سلطنت کی مالی حالت ابتر ہو چکی تھی، خزانہ خالی تھا اور اقتصادی بدحالی اور مشکلات کی وجہ سے عوام میں بے چینی پھیل گئی تھی۔

خدمات کا خیال اور خانہ جنگی کا اندیشہ ہے، جو ترکوں کو کسی جارحانہ اقدام سے باز رکھتا ہے ورنہ ترک ویسے ہی پکے مسلمان ہیں جیسے ان کے آباؤ اجداد تھے اور وہ تفرنج (مغربیت) کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مختصر یہ کہ ترکی کا مستقبل کسی صورت میں بھی مایوس کن نہیں ہے۔

اسلام کا مستقبل

یہاں سے سلسلۂ کلام تہذیبِ مغربی اور اسلام کے تصادم کی طرف چل پڑا۔ فرمانے لگے کہ یورپ کے سفر[۱۳] کے دوران میں میں نے دیکھا ہے کہ یورپ میں خواص کے علاوہ اب عوام میں بھی اسلام کے متعلق دلچسپی اور تجسس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ادھر مشرق میں مغربی تہذیب کا اثر ترقی پر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامی تہذیبوں میں صلیبی جنگوں نے جو تفریق ڈال دی تھی وہ اب دور ہونے والی ہے اور مشرق و مغرب پھر بغل گیر ہوں گے۔ میں نے کہا "اغلب ہے کہ ایسا ہو جائے مگر کیا معلوم اسلام مغربی تہذیب کو اپنا لے یا مغربی تہذیب اسلام کو جذب کر لے؟"

بولے ہاں عقلی طور پر تو دونوں صورتیں ممکن ہیں، مگر ہمارے عقیدے اور اسلام کی گزشتہ تاریخ کی رو سے پہلی صورت ہی کی تائید ہوتی ہے۔ عقیدۃً تو "اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ"[۱۴] کا وعدہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اسلام ہی غالب آئے گا ساتھ ہی اسلام کی تاریخ صاف صاف بتاتی ہے کہ اسلام کے مقابلے میں مختلف تہذیبیں آئیں مگر اسلام نے مقابلہ کیے بغیر ان کو اپنا کر ان پر ایسی مہر ثبت کی کہ وہ خود اسلامی

---

[۱۳] علامہ دوسری گول میز کانفرنس (منعقدہ ۷ ستمبر ۱۹۳۱ تا یکم دسمبر ۱۹۳۱) میں شرکت کے لیے انگلستان گئے تھے۔ اس سفر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سفر نامۂ اقبال، محمد حمزہ فاروقی۔

[۱۴] بلاشبہ ہم اس کے محافظ ہیں (قرآن)

تہذیب کا جزو بن گئیں۔ یونان اور ایران کی تہذیبیں دونوں اسلام میں جذب ہو کر گویا "مسلمان" ہو گئیں۔ اسی طرح اغلب یہی ہے کہ مغربی تہذیب بھی اسلام میں جذب ہو کر اسلامی ہو جائے گی۔ قیاس یہی کہتا ہے، آگے خدا کو معلوم کیا ہوگا۔ کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

فلسفہ اور مذہب

یہاں پہنچ کر میں نے اپنی نظم "سوال بہ اقبال"[۱۵] یاد دلائی اور کہا کہ میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے انگریزی خطبات[۱۶] کا مطالعہ کیا۔ بعض نکات کچھ صاف ہو گئے مگر کچھ ابھی باقی ہیں۔ اس پر فرمایا کہ نہیں۔ جو آپ کہتے ہیں کہ صاف ہو گئے ہیں وہ بھی صاف نہیں ہوئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا۔ فلسفے کا کام تو یہ ہے کہ آج چند مشاہدات پر بنیاد رکھ کر ایک خیال (CONCEPT) قائم کیا جاتا ہے جو یقینی نہیں بلکہ صرف ممکن (PLAUSIBLE) ہوتا ہے کل ماحول مختلف ہو جاتا ہے۔ نقطۂ نظر بدل جاتا ہے تو ایک دوسرا (CONCEPT) قائم کرنا پڑتا ہے اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ انسان بڑھتا چلا جاتا ہے مگر کسی منزل تک نہیں پہنچتا۔ اگر فلسفہ انسان کی تسکین کر سکتا تو مذہب کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اسی کمی کو پورا کرنے کیلئے مذہب کا وجود ہے (حاسۂ مذہبی) RELIGIOUS EXPERIENCE کم از کم فرد کی تسکین ضرور کر دیتا ہے۔ ہمارے صوفیائے کرام رح نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ یہ حاسۂ مذہبی معانقہ و توجہ سے ایک فرد سے دوسرے فرد میں منتقل کیا جائے۔ بالخصوص نقشبندیہ اور مجددیہ سلسلے کو اس میں کامیابی بھی ہوئی۔ میں نے پوچھا "یہ آپ محض منقولات پر اعتبار کرتے ہوئے فرما

---

۱۵ "میں نے چند اشعار میں فلسفۂ خودی کے بعض متضاد پہلوؤں کے متعلق حضرت علامہ سے سوال کئے تھے۔ یہ اشعار رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے تھے"
(اسد ملتانی)

۱۶ RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

رہے ہیں یا تجربۃً "درست سمجھتے ہیں؟" بولے کہ ان کی صحت میں مجھے بالکل شک نہیں۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہوتا کیونکر ہے۔ ممکن ہے کہ علمِ نفسیات ترقی کر کے اس راز کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔

میں نے سوال کیا کہ آخر اس حاسۂ مذہبی کے حصول کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ بولے "آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے؟" میں نے کہا "بی۔ اے کا" بولے کہ اس کے لیے کتنا وقت صرف کیا؟ میں نے کہا "چودہ برس" کہنے لگے "تو کم از کم کچھ سال تو اس طرف بھی لگائیے۔ یونہی کیوں کر حاصل ہو سکے؟" میں نے کہا "یہ تو بے شک درست ہے مگر ایسے شخص نظر نہیں آتے جو راہنمائی کر سکیں۔ آپ نے خود بھی تو صوفی کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ: ع

خبرِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من [۱۷]"

غیر معمولی انسان

مسکرا کر کہنے لگے کہ یہ من حیث الجماعت لکھا ہے اور واقعی اس وقت صوفیہ کا یہی حال ہے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ GENIUS (غیر معمولی انسان) ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ کبھی زیادہ اور کبھی کم۔ آج کل بھی ایسے شخص ضرور ہوں گے اور ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب جماعت روبہ ترقی ہوتی ہے تو اس میں بکثرت GENIUS پیدا ہوتے ہیں اور انحطاط کے زمانے میں کم۔ ترقی پذیر جماعتوں میں اگر ایک غیر معمولی انسان اٹھ جاتا ہے تو فوراً اس کی جگہ پُر کرنے کو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے لیکن روبہ انحطاط جماعتوں میں ایک GENIUS اٹھ جانے سے وہ جگہ خالی ہی رہتی ہے۔

---

[۱۷] پیامِ مشرق میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ ع

ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من (پیامِ مشرق ایڈیشن ۱۹۴۲ء، ص ۲۰۱)

میں نے کہا کہ جماعت کی اصلاح GENIUS کی کثرت پر موقوف ہے اور بقول آپکے GENIUS بکثرت اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب جماعت رُو بہ ترقی ہو، تو یوں کہنا چاہیئے کہ انسان کا اختیار کچھ بھی نہیں۔ قدرت جب چاہتی ہے جماعت کو ترقی دے دیتی ہے اور جب چاہتی ہے گرا دیتی ہے۔ یہ تو FATALISM (جبریت) ہوئی۔ بولے "اس میں کیا شک ہے FATALISM سے قطعاً انکار نہیں ہو سکتا۔ سائنس بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے، اگرچہ وہ اس لفظ سے ڈرتی ہے اور اس کی جگہ PREDESTINATION (مقدر) کا لفظ استعمال کرتی ہے مگر بات ایک ہی ہے۔

GENIUS کی پیدائش کے متعلق ابھی تک انسان کچھ نہیں معلوم کر سکا۔ خبر نہیں قانون حیات کے اسرار کیا ہیں؟ ممکن ہے کہ آئندہ چل کر انسان کچھ زیادہ معلومات بہم پہنچا سکے۔ سر دست تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سمندر کبھی کبھی لہروں کے ساتھ موتی اچھال کر کنارے پر پھینک دیتا ہے اسی طرح فطرت بھی کبھی کبھی GENIUS اچھال دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ زندگی بھی "مقادیر برقیات" QUANTUM کے مطابق قطعِ سفر کرتی ہے"۔ میں نے کہا "یعنی اُچھل اُچھل کر چلتی ہے؟" فرمایا "ہاں! بالکل اسی طرح"۔

عالمِ اسلام

عالم اسلام کے متعلق فرمایا کہ پچھلی چند صدیوں میں اسلام کا زمانہ انحطاط رہا، اس لیے اعلیٰ شخصیتیں بہت وقفے کے بعد پیدا ہوئیں۔ مثلاً امام غزالی[18] مولانا روم[19] اور شاہ ولی اللہ[20] جیسی ہستیاں۔ مگر کچھ عرصے سے رنگ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اعلیٰ ہستیاں پے بہ پے پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً

---

[18] ۔ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

[19] ۔ ترکی کے شہرہ آفاق شاعر و صوفی، (۶۰۴ھ۔ جمادی الثانی ۶۷۲ھ)۔

[20] ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء میں فوت ہوئے۔

سر سید احمد خاں[۲۱]، جمال الدین افغانی[۲۲]، قاضی اعظم جان[۲۳] (روس)، مفتی محمد عبدہ[۲۴]، سعد زاغلول پاشا[۲۵] اور موجودہ زمانے میں امان اللہ خاں[۲۶]، رضا شاہ[۲۷]، مصطفےٰ کمال[۲۸] ابن سعود[۲۹] وغیرہ۔ یہ سب اس امر کی علامت ہیں کہ اسلام میں دوبارہ ترقی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور ممکن ہے بہت جلد کوئی غیر معمولی انسان پیدا ہو کر عظیم الشان انقلاب کا باعث ہو۔

مردِ منتظر

یہاں پہنچ کر میں نے سوال کیا کہ آپ کے اس خیال کے متعلق طرح طرح کے شکوک ظاہر کیے جاتے ہیں کہ آپ اعلیٰ انسان کے منتظر ہیں، جیسا کہ آپ نے "اسرار و رموز" میں بھی فرمایا ہے ع

اے سوار اشہب دوراں بیا

اس سے کیسی شخصیت مراد ہے؟ کیا آپ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور انسانِ کامل کی توقع بھی رکھتے ہیں؟ بولے "ہرگز نہیں۔ میں دوسروں، بالخصوص اہلِ

---

۲۱ بانی علی گڑھ تحریک، (۱۸۱۷/۱۲۳۲ھ تا ۱۸۹۸/۱۳۱۵ھ)

۲۲ اتحادِ عالم اسلام کے عظیم داعی (۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸۔ شوال ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷)

۲۳ روس کے مسلمان مصلح

۲۴ مفتی مصر و شاگرد سید جمال الدین افغانی (۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹۔ ۱۳۲۳/۱۹۰۵)

۲۵ مصر کی قوم پرور اور سرفروش پارٹی "حزب الوفد" کے بانی (م ۱۹۲۷)

۲۶ سابق شاہ افغانستان (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲۔ ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰۔

۲۷ بانی خاندانِ پہلوی و والدِ محمد رضا شاہ پہلوی (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۷۔ ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴)۔

۲۸ جدید ترکی کے بانی (۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱۔ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸)

۲۹ بانی حکومت سعودیہ عربیہ ابنِ سعود عبد العزیز عبد الرحمان (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳)

شیعہ کی طرح کسی خاص انسان کے انتظار میں نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی انسان کامل کی توقع ہو سکتی ہے میں نے جس کی تمنا ظاہر کی ہے وہ یہی اعلیٰ قسم کی ہستیاں ہیں جو آکر سوسائٹی کو بلند کر دیتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک ہی ہستی ہو بلکہ ممکن ہے کہ ایک قوم کی قوم ہو۔" میں نے کہا "آپ کے مصرع مذکور سے تو ایک ہی انسان کا خیال پیدا ہوتا ہے۔" بولے "نہیں، آپ ہی بتایئے کہ ایک ایسی قوم کی توقع ظاہر کرتے ہوئے میں شاعرانہ زبان میں ان الفاظ کے علاوہ اور کیا الفاظ استعمال کر سکتا تھا؟"

مکتوبات مجدد سرہندی رح

سلسلۂ گفتگو پھر تصوف کی طرف مڑا۔ فرمانے لگے کہ تصوف کا علم پرانا اور کسی قدر نکما ہو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ زمانۂ حاضر کے علمِ نفسیات کی روشنی میں اس کی پھر تجدید کی جائے۔ اس کام میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح[۳۰] کی تحقیقات بہت امداد دے سکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے مکتوبات و ملفوظات کا ایک منتخب ایڈیشن شائع کیا جائے جو (مجموعہ) اس وقت موجود ہے اس میں بہت سی کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے کیونکہ انہوں نے اپنے معتقدین کے ہر قسم کے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ بعض نہایت عام فقہی مسائل ہیں اور بعض نہایت اہم صوفیانہ نکات۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہی صوفیانہ نکات کا انتخاب علیحدہ شائع کیا جائے اور پھر اس کی بنا پر موجودہ نفسیات کی روشنی میں جدید علمِ تصوف کی بنیاد ڈالی جائے۔

مقصدِ حیات

اخگر صاحب نے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب! انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے؟ بولے "اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ویسے زندگی خود بخود کوئی نہ کوئی مقصد اپنے لیے متعین کر لیتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرتی ہے۔"

---

[۳۰] ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۷ء میں فوت ہوئے۔

فہم قرآن

مولانا محمد احمد نے پوچھا کہ قرآن کس طرح پڑھنا چاہیئے؟ میں نے ندوہ کا امتحان پاس کیا ہے اور مجھ پر قرآن شریف کی تعلیم کے متعلق کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ مختلف بزرگ مختلف راستوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً "ترجمان القرآن" ایک نقطۂ خیال پیش کرتا ہے اور آپ کا کلام دوسرا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی راہ اختیار کی جائے؟ سن کر اخگر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "مولانا! یہ وہی آپ کی رباعی والا مضمون ہے: ع

تفسیر نے قرآں کو چھپا رکھا ہے [۳۲]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے بہترین ذریعہ اپنا ضمیر ہے اس کے متعلق مجھے اپنے والدِ مرحوم کا قول یاد ہے بلکہ اسی قول نے میری زندگی پر بہت کچھ اثر بھی ڈالا۔ واقعہ یوں ہے کہ میں ابھی سکول میں تھا یا کالج کی پہلی جماعت میں جب ایک صبح والدِ مرحوم میرے کمرے میں آئے۔ میں حسب معمول قرآن شریف کی رسمی تلاوت کر رہا تھا۔ پوچھنے لگے کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے کیا مطلب ہے جبکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ میں قرآن پڑھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ قرآن پڑھ رہا ہوں۔ کہنے لگے "ہاں! مگر قرآن شریف میں کیا پڑھ رہے ہو؟ کچھ سمجھتے بھی ہو یا یونہی پڑھتے چلے جاتے ہو؟" میں نے کہا "تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں اور کچھ نہ کچھ مطلب بھی سمجھتا ہوں"۔ بولے "نہیں۔ قرآن شریف کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک یہ اسی طرح نازل نہ ہو جیسے رسول اللہؐ پر نازل ہوا تھا"۔

---

[۳۲] اس ملاقات سے چند روز پہلے کسی اور مجلس میں اخگر صاحب نے کچھ رباعیات سنائی تھیں جن کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اب اس کا مزید ثبوت یہ ملا کہ رباعی ڈاکٹر صاحب کو یاد رہ گئی تھی۔ (اسد ملتانی)

میں یہ سن کر متعجب ہوا کیوں کہ اس فقرے کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ لیکن یہ فقرہ میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا اور ایک عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی اس میں ایک بڑی رمز پنہاں ہے اور اب تو میں اس کی صداقت کا پورے پوری طرح قائل ہوں۔ یہی نقطۂ خیال میری زندگی پر بہت کچھ اثر انداز بھی ہوا ہے۔ واقعی انسان کے ضمیر کی نشو و نما اس قدر ہونی چاہیئے کہ قرآن شریف کی حقیقت کو اُسی طرح سمجھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محسوس فرماتے تھے اور ایسا معلوم ہو کہ قرآن براہِ راست نازل ہو رہا ہے۔

اقبال انا اور تخلیق

اقبال، انا اور تخلیق، کے عنوان سے جناب خواجہ عبدالحمید صاحب لیکچرر فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور کا ایک مضمون معارف اعظم گڑھ کی اشاعت نومبر و دسمبر ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے اقبال کے اس نظریہ کی وضاحت کی کہ بشری انا ایک ایسا فاعل ہے جو اپنے اندر تخلیق و تجدید کی استعداد رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں مضمون نگار نے کائنات کی تغیر پذیری، بشری انا کی خصوصیات، عشق صلوٰۃ اور فقر کے زیر اثر انا کی تربیت و تہذیب، مردِ مومن، نیابتِ الٰہی انا اور خیر و شر کی نمائندگی وغیرہ مباحث پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے اس مضمون کا بہت سا حصہ حضرت علامہ اقبال کے اس اہم خط پر مبنی ہے جو انہوں نے اسرار خودی کے سلسلے میں ڈاکٹر نکلسن کو لکھا تھا اور جس کے اقتباسات ڈاکٹر نکلسن کے ترجمۂ اسرار خودی میں شامل ہیں۔

جناب اسد کا زیر نظر مضمون فلسفۂ خودی کے ان مباحث سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ اسے صرف زبور عجم کی اس نظم کی تفہیم کے سلسلے میں ایک کوشش قرار دیا جا سکتا ہے جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است
جلوۂ او، گردِ دیدۂ بیدارِ من است

(جعفر)

حضرت علامہ اقبالؒ کے شعر و فلسفہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور علمی نقطۂ نظر سے یہ ایک مبارک علامت ہے لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ یا تو ان کے متفرق اشعار کچھ کہیں سے اور کچھ کہیں سے لے کر چند تشریحی جملوں کے ذریعہ باہم مربوط کر دیے جاتے ہیں اور اس طرح ایک خاصا دلچسپ مگر بالکل سطحی قسم کا ادبی مضمون تیار ہو جاتا ہے، اور یا پھر کوئی مقالہ نگار اپنے ذہن میں

چند مخصوص فلسفیانہ نظریات جمع کر لیتا ہے اور جہاں جہاں اسے اقبال کے اشعار سے ان نظریات کی تائید ہوتی نظر آتی ہے، وہاں ان اشعار کو بے تکلف استعمال کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح ایک اچھا خاصہ فلسفیانہ مقالہ لکھ ڈالتا ہے، ظاہر ہے کہ اقبال کے شعر و فلسفہ کی صحیح تفسیر نہ ایسے مضامین سے ہو سکتی ہے اور نہ اس قسم کے فلسفیانہ مقالات سے، اندریں حالات کوئی ایسا مضمون دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے جس میں ذرا محنت و کاوش سے اقبال کے نظریات اور تعبیرات کی اصلی روح کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہو، چنانچہ اسی قسم کا ایک قابل قدر مقالہ وہ تھا جو خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے لکچرر گورنمنٹ کالج لاہور کے قلم سے بہ عنوان "اقبال۔ انا اور تخلیق" نومبر اور دسمبر ۴۴ء کے معارف میں شائع ہوا، جیسا کہ تمہیدی نوٹ میں بتایا گیا ہے خواجہ صاحب نے "کل ہند فلاسفی کانگریس" کے اجلاس لاہور میں اس موضوع پر انگریزی زبان میں ایک لکچر دیا تھا، اس کا ملخص رسالہ وشوا بھارتی شانتی نکیتن کے دو نمبروں میں اشاعت پذیر ہوا، اور وہی معارف میں ایک تفصیلی مقالے کی صورت میں نکلا ہے،

اس مقالے کا پہلا حصہ اس لحاظ سے خاص طور پر جاذب توجہ ہے کہ اس میں علامہ اقبالؒ کے "نظریہ خودی" کو نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے اور جہاں کہیں اس نظریہ اور بعض فلاسفۂ قدیم و جدید کے نظریات میں مماثلت نظر آئی ہے، وہاں اس بنیادی فرق کو نمایاں کیا گیا ہے، جو اس ظاہری مماثلت کے پردے میں پایا جاتا ہے، اس طرح جہاں فلسفہ میں اقبال کی مجتہدانہ حیثیت آشکارا ہو جاتی ہے، وہاں ان سطحی تبصرہ نگاروں کی بھی قلعی کھل جاتی ہے، جو ذرا سی ظاہر مماثلت کی بنا پر اقبال کے نظریہ کو بعض مغربی فلسفوں کی خوشہ چینی سمجھنے لگتے ہیں اسی طرح مقالے دوسرا حصہ بھی خوب ہے، لیکن موضوع کو بہت پھیلا کر سمیٹنے

کی کوشش میں بہت سی باتیں تشنۂ تشریح رہ گئی ہیں، بلکہ بعض مقامات پر تو غلط فہمیوں کا بھی احتمال پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ ان کے متعلق معارف کی طرف سے اختتامی نوٹ میں مناسب طور پر اشارہ کر دیا گیا ہے۔[1]

---

[1] مدیر معارف سید ریاست علی ندوی نے خواجہ صاحب کے مضمون کے آخر میں اپنے ایک نوٹ میں لکھا تھا۔

"اقبال کے نظریۂ انا اور اس کے ذوقِ تخلیق کا موضوع مزید تشریح کا محتاج ہے نہ اقبال کا یہ مدعا ہے کہ عام اناؤں کو درجہ خالقیت دے دیا جائے نہ حلاج کی شانِ خودی کی اس میں ترجمانی ہے اور نہ یہ مقصود ہے کہ نعوذ باللہ، خدا کو انسان کی خودی میں جذب کر لیا جائے۔ یہ مفاہیم نہ اقبال کے کلام میں ہیں اور نہ ہمارے فاضل مقالہ نگار نے انہیں پیش کرنا چاہا ہے۔"

سید ریاست علی ندوی کے اس نوٹ سے اختلاف ممکن ہے۔ علامہ اقبال کے مذکورہ بالا مکتوب بنام نکلسن میں عام اناؤں کی خالقیت کا نظریہ قرآن حکیم سے استنباط کیا گیا ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝

ترجمہ: سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔ المومنون: ۱۴

البتہ دیگر اناؤں کی یہ صفت خالقیت بھی جیسا کہ خواجہ صاحب نے وضاحت کی ہے انائے کبیر کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ جہاں تک خدا کو انسانی خودی میں جذب کرنے کے خیال کا تعلق ہے خود حضرت علامہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں

He who comes nearest to God is the completest person. Not that he is finally absorbed in God, on the contrary, he absorbs God into himself.

یہاں اس مقالے کے ان اختلافی پہلوؤں پر بحث کرنا مقصود نہیں، لیکن اس میں اقبال کے چند اشعار کی جو انوکھی تاویل کی گئی ہے، اس پر اظہار خیال کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا،

اس نکتے کی تفسیر میں حضرت علامہ نے اسی خط میں لکھا ہے

The Prophet said,
'Create in yourselves the attributes of God.' Thus man becomes unique by becoming more and more like the most unique individual.

حسین بن منصور حلاج کے بارے میں ایک زمانے میں علامہ اقبال کا خیال یہ تھا:

"منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین جس کا ذکر ابن حزم کی "فہرست" میں ہے، فرانس میں شائع ہو گیا ہے۔۔۔۔ حسین کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزا دہی میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابنِ حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ غیر صوفیا قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے۔ معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو گئے۔ (مکتوب محررہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء بنام حافظ محمد اسلم جیراجپوری (اقبال نامہ حصہ اول ص ۵۴/۵۵) حلاج کے بارے میں انہی خیالات کا اظہار حضرت علامہ اس سے پہلے بھی ایک خط میں کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو:

"میں نے تو محی الدین (ابن عربی) اور منصور حلاج کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سنجانی (حضرت علاء الدولہ سنجانیؒ) اور جنید (حضرت جنید بغدادی) نے

زبور عجم میں ایک نظم ہے۔

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندار من است
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است

ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے او را
حلقۂ ہست کہ از گردش پرکار من است

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من
چہ زمان و چہ مکاں شوخی افکار من است

ان دونوں بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ ہاں ان کے عقائد اور خیالات سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے۔ اگر اسی کا نام مادّیت ہے تو قسم بخدائے لایزال مجھ سے بڑھ کر مادّہ پرست دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔"

(مکتوب محررہ ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء بنام اکبر الہ آبادی اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۵)

لیکن حلاج اور تصوف کے بارے میں حضرت علامہ کی یہ رائے بعد میں تبدیل ہوگئی چنانچہ علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں۔

"عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اقبال مرتے دم تک وحدتِ وجود اور سریان کے مخالف رہے، لیکن یہ عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اواخرِ عمر میں وحدتِ وجود کی طرف دوبارہ رجوع لانے پر مجبور ہوگئے تھے۔" (اقبال کا علم کلام ص ۱۰۰)

جلالپوری صاحب نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں حضرت علامہؒ کی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے خطبۂ چہارم کا حوالہ دیا ہے جس میں حضرت علامہ نے منصور کو شہید صوفی Martyr-saint لکھا ہے اور اس کے انا الحق کا ترجمہ 'I am the creative truth' کے الفاظ میں کیا ہے۔

از فسوں کاری دل سیر و سکوں عیب حضور

ایں کہ غماز و کشا یندۂ اسرار من است

اسی طرح اقبال ضرب کلیم کی ایک نظم "قم باذن اللہ" میں فرماتے ہیں ؎

کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے　　تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں

"واضح ہو کہ حسین ابن منصور حلاج نے جو صرف منصور کے نام سے مشہور ہیں، ایک خاص جذبہ سے مغلوب ہو کر انا الحق کہہ دیا تھا۔ علماء نے اس کلمہ سے وہی معنی مراد لیے جو لفظوں سے ظاہر ہوتے ہیں یعنی میں حق (خدا) ہوں اور ان پہ یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے چنانچہ اس الزام کی پاداش میں انہیں قتل کرا دیا۔ بعد ازاں بعض بزرگوں نے منصور کے اس قول کی تاویل کی اور ان کو اہل اللہ میں شمار کیا۔" جناب چشتی، ان تاویل کرنے والوں میں شیخ اکبر ابن عربی، مولانا روم، حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کا ذکر کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں

"ہمارے زمانے میں اقبال نے بھی اپنے مذاق کے مطابق اس قول کی تاویل کی ہے چنانچہ گلشن راز جدید میں لکھتے ہیں کہ ؎

بخود گم بہر تحقیق خودی شو

انا الحق گو و صدق خودی شو

یعنی خودی کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ میں گم ہو جا۔ انا الحق کہہ دے اور اس طرح خودی کی حقانیت کا اثبات کر دے جیسا کہ اقبال نے خود مجھ سے کہا تھا، انا الحق، کا مطلب یہ ہے کہ انا، حق ہے، باطل نہیں ہے۔ (شرح ضرب کلیم ص ۱۸۹ تا ۱۹۱)

ان اقتباسات سے اقبال کے فلسفۂ خودی کے بارے میں جناب خواجہ عبدالحمید کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔　　(جعفر بلوچ)

آن جہانے کہ درو کاشتہ رامی درو ند
نور و نارش ہمہ از سبحہ و زنار من است
سازِ تقدیرم و صد نغمۂ پنہاں دارم
ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد تارِ من است
اے من از فیض تو پایندۂ نشان تو کجاست
ایں دو گیتی اثر ماست، جہان تو کجاست

تعجب کی بات ہے کہ اس نظم کے سمجھنے اور سمجھانے میں اکثر ارباب فکر نے ٹھوکر کھائی ہے اور اس کے صاف اور سیدھے معانی بیان کر دینے کے بجائے خواہ مخواہ بے سروپا توجیہوں اور دور از کار تاویلوں سے کام لیا ہے،

علامہ اقبال کی شاعری کے متعلق اردو میں جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصنیف "روح اقبال" غالباً سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ مندرجہ بالا نظم کے ساتھ اس کتاب میں بھی مناسب سلوک نہیں کیا گیا، محترم مصنف نے شاعر اور عالم فطرت کا عنوان دے کر پہلے یوں تمہید باندھی ہے۔

"یہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا آرٹسٹ یا شاعر کے اندرونی جذبات و کیفیات کا تجزیہ تھا، ان کی بدولت وہ اپنے دل کو کائنات سے متحد کر لیتا ہے، اس کے دل کی ہنگامہ زائیاں شورشِ حیات کی ایک بولتی ہوئی تصویر بن جاتی ہیں، اس کا نغمہ زندگی کے زیر و بم میں توازن پیدا کرتا ہے اور اس کے درد کی کسک کائنات کی روح کو تڑپا دیتی ہے، شاعر کے دل کی اندرونی دنیا کا حال ہم سن چکے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی دنیا اور خارجی عالم میں کس طرح رشتہ جوڑتا ہے، وہ اپنے آرٹ

کے ذریعہ فطرت سے تعلق پیدا کرتا اور اپنے نفس گرم سے اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے، فطرت کی سرگوشیوں کو سنتا ہے یا یوں کہئے کہ اپنے جذبات کو فطرت پر طاری کر دیتا ہے، فطرت جو بات ہکلا ہکلا کر اکھڑے اکھڑے طور پر کہتی ہے، اس کو وہ اپنی شدت احساس کی بدولت موزوں طریقے سے بیان کر دیتا ہے، وہ اپنے جذب دروں سے حقیقت مدرکہ میں گہرائی پیدا کر دیتا ہے، فطرت کے جلوؤں کی رنگارنگی اور رعنائی آرٹسٹ کے دل میں جب اپنا عکس ڈالتی ہے، اور اس کے جذبات میں حل ہو کر اظہار چاہتی ہے، تو اس وقت دراصل وہ اپنے وجود کی غایت پوری کرتی ہے، فطرت کا کمالِ وجود یہ ہے کہ وہ اہل نظر کو اپنی طرف مائل کرے اور اس کی مشہود بنے تاکہ وہ اپنے تاثر جمال کو اس کے توسط سے ظاہر کر سکے فطرت اس وقت تک حسن سے عاری رہتی ہے جب تک انسانی نظر اس میں جمال آفرینی نہ کرے، شفق کے منظر میں اسی وقت دل کشی آتی ہے، جب کوئی صاحب نظر اس کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ وہ دیکھو کیا خوبصورت منظر ہے، فطرت کا وجود آرٹسٹ کا ممنون نظر ہوتا ہے، اقبال نے اس مضمون کو کیا خوب ادا کیا ہے۔

جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما — ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
خودی اُو را بہ یک تارِ نگہ بست — زمین و آسمان و مہر و مہ بست
دل ما را بہ او پوشیدہ راہے است — کہ ہر موجود ممنونِ نگاہے است
گر او را کس نہ بیند زار گردد — اگر بیندیم و کہسار گردد
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست — کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست

(روح اقبال ص ۲۹-۳۰)

اور اس کے بعد نظم مذکور کے معانی کی طرف ان الفاظ میں رہنمائی کی ہے۔

"فطرت کے بے معنی طومار میں آرٹسٹ کی نظر نظم و معنی پیدا کرتی ہے، آرٹسٹ فطرت کے تضادوں اور غیر ضروری تفصیلات کو الگ کر کے ان میں ربط قائم کر دیتا ہے، وہ جب اپنے تصورات میں ربط و نظم پیدا کرنا چاہتا ہے، تو عالم کو بھی اپنے ذہنی ربط و نظم سے وابستہ کر لیتا ہے وہ ایک ایک کر کے ان سب رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے جو فطرت کے اظہار میں مانع آتی ہیں، اور اس کی راہ میں سنگِ گراں بن کر کھڑی ہوتی ہیں، وہ حقیقت کو آزاد کرتا، اور اس میں شوخیِ فکر سے نزاکت پیدا کر دیتا ہے، فطرت کے جلووں کی بوقلمونی اس کے دیدۂ بیدار کی رہینِ منت ہے بغیر اس کے دستِ فطرت کی حنا بندی کرنے والا کوئی نہیں، زمان و مکان بھی اس کی شوخیِ فکر کے آئینہ دار ہیں،

ایں جہاں چیست! صنم خانۂ پندارِ من است — جلوۂ او گردِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے اُو را — حلقۂ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من — چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است

(روحِ اقبال۔ ص ۳۰-۳۱)

اس کے برعکس خواجہ عبدالحمید صاحب پیشِ نظر مقالے میں اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"انا جب اپنی خودی سے آگاہ ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ انا نے جب اپنی خودی کی تعمیر کر لی تو وہ اپنے سامنے نئی دنیائیں کھلتی دیکھتا ہے اس کا پہلا عمل اس کے لیے تنگ ہو جاتا ہے، (شایانِ جنونِ من پہنائے دو گیتی نیست) اس کی نظر زیادہ جسور اور شوخ، اس کی امنگ بے قید، اس کا بازو ہمہ گیر

اور اس کی گرفت مضبوط تر ہو جاتی ہے، نگاہِ ما بہ گریبان کہکشاں افتد،

ایسا انا اپنے تخلیقی جوش سے سرشار و مجبور ہو کر بول اٹھتا ہے۔ ؎

این جہان چیست؟ صنم خانۂ پندار من است — جلوۂ او گردِ دیدۂ بیدار من است

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من — چہ زمان و چہ مکان شوخیِ افکار من است

کیا یہ دعویٰ مجذوب کی بڑ ہے یا مبنی بہ حقیقت ہے؟ شاعر کا مبالغہ ہے یا امر واقعہ کا اقرار؟ یہ بحث لمبی ہے اقبال مبالغہ کا قائل نہیں ہے اس لیے اس کے منشا کی صحیح تعیین کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان (اور ایسے دوسرے اشعار میں) من و ما سے کیا مراد لیتا ہے ظاہر ہے کہ "من و ما" فرد ہے، لیکن صوفیہ اور حکما، کا ایک گروہ ایسا گذرا ہے جن کی تعلیم یہ تھی، کہ یہ من درحقیقت بشری انا نہیں ہے بلکہ اس کی وہ حالت ہے جب وہ اپنی معراج پر پہنچ کر انائے کبیر میں مل جاتا ہے، اقبال کی تعلیمات سے اس عقیدہ کی تائید نہیں ہوتی، لیکن ایک دوسرا گروہ ہے، جن سے (کم از کم اس اہم امر میں) اقبال متفق نظر آتا ہے، اس گروہ کے مطابق انا کی معراج یہ نہیں ہے کہ وہ انائے کبیر میں ضم ہو جائے بلکہ وہ اس سے اس طرح سیراب اور فیضیاب ہوتا ہے، کہ انائے کبیر کی تخلیقی فعلیت کمال جوش و خروش سے اس میں جاری و ساری ہو جاتی ہے۔" (معارف نومبر ۴۴ء)

اور کچھ تمثیل و تشریح کے بعد بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:۔

"الغرض اقبال کے نزدیک انا ہر حالت میں فرد ہے اور جب یہ فرد انا اقبال کی زبان سے پکارتا ہے کہ

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من — چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکار من است

تو ہمیں یہ اجازت نہیں ہے کہ ہم اس دعوی کی محض داخلی تاویل کریں بلکہ صحیح تاویل یہ ہے کہ بشری انا ارتقاء کے اس درجے تک پہنچ گیا ہے، کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے، انائے کبیر کی نظر سے دیکھتا ہے، یا یوں سمجھئے

کہ کم از کم ایک خاص لمحے کے لیے انائے کبیر کی ہمہ گیر نظر اسے مستعار مل گئی ہے اور وہ سب قیود سے بالاتر ہو کر ہر چیز کو دنیوی، امکانی اور اضافی نظر سے نہیں بلکہ اُسی مطلق نظر سے دیکھتا ہے، جو انائے کبیر سے مخصوص ہے ....." (معارف دسمبر ۴۴ء)

گویا ایک کے نزدیک آرٹسٹ عالم فطرت کی بے ترتیبی میں اپنے تخیل سے نظم و ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کرتا اور اس بنا پر کائنات کو اپنی تخلیق سمجھنے لگتا ہے، دوسرے کے نزدیک کائنات کا یہ تصور انسان کی طاقت ہی سے باہر ہے اور اس کا احساس اسے صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ اپنی نہیں بلکہ انائے کبیر کی نظر سے دیکھتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں تشریحیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں، لہذا دونوں تو صحیح ہو نہیں سکتیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو میں سے کون سی شرح صحیح ہے،

جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہ دونوں شرحیں حقیقت سے بہت دور ہیں اور غلط فہمی کا باعث ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ پوری نظم بالخصوص آخری شعر کو مدنظر نہیں رکھا گیا اور دوسرے یہ کہ اشعار کو کائنات کی تخلیق سے متعلق سمجھا گیا ہے، حالانکہ یہ محض ادراک و مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پوری نظم کو سامنے رکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم نہ شاعرانہ تخیل کا نتیجہ ہے اور نہ خدائی نقطۂ نظر کی ترجمانی، بلکہ انسان اور محض انسان کے مطالعۂ کائنات پر مبنی ہے، یہ دعوے نہ مجذوب کی بڑ ہے، نہ شاعر کا مبالغہ بلکہ امر واقعہ ہے اور عین حقیقت ان اشعار میں "من و ما" سے کوئی فوق البشر یا غیر معمولی انا نہیں، بلکہ انسان اور مطلق انسان مراد ہے جو حواس خمسہ کے ذریعہ اس مادی دنیا کو محسوس کرتا، اور ذہنی طور پر اس دنیا کے مقابلے میں ایک عقبیٰ کا تصور کر سکتا ہے اس نظم کے پہلے تین شعر "ایں

جہاں" یعنی اسی مادی دنیا کے متعلق ہیں، پانچواں اور چھٹا شعر "آن جہاں" یعنی عقبیٰ کے بارے میں ہے اور چوتھا شعر دونوں جہاں پر حاوی ہے، آخری شعر کا استفہام پوری نظم کی جان ہے اور ایسا سوال جس کے اندر جواب بھی پوشیدہ ہے۔

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ اقبال نے اس جہان کو اپنے پندار کا صنم خانہ کیوں کہا ہے بات یہ ہے کہ اس مادی دنیا کا علم ہمیں اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے شروع شروع میں تو ماہرین طبیعیات نے اپنے معلومات کے گھمنڈ میں یہی خیال کیا، کہ بس کل کائنات یہی ہے جس کا پتہ ہمارے حواسِ خمسہ دے رہے ہیں، اس پر انہیں ایک طرح کی ہمہ دانی کا احساس ہونے لگا، اور اسی سبب سے مادیت کو خاص فروغ حاصل ہوا، لیکن جوں جوں تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا گیا بجلی کی رو، مختلف قسم کی شعاعوں اور ریڈیو کی لہروں جیسی چیزوں کا انکشاف ہوا، تو اہل سائنس کا نقطۂ نظر بدلنے لگا اب انہیں اس بات کا یقین نہ رہا کہ کائنات صرف انہی اشیاء پر مشتمل ہے جن کا علم ہمیں حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے، جب ہمیں اپنے گرد و پیش کی بعض چیزوں کا علم اتنے عرصہ کے بعد ہوا تو کیا عجب ہے کہ یہاں اور بھی بہت سی چیزیں ایسی موجود ہوں جن کا انکشاف ہماری مزید علمی ترقی کا منتظر ہو۔

اس اندازِ خیال نے مادیت کو بہت جلد لاادریت کی منزل میں پہنچا دیا، اب کوئی اہل علم بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے حواسِ خمسہ تمام موجودات عالم کا ادراک کر سکتے ہیں، علاوہ ازیں حواسِ خمسہ میں سے ہر ایک کا دائرہ علم بالکل الگ ہے آنکھ کسی آواز کو سن نہیں سکتی اور کان کسی روشنی کو دیکھ نہیں سکتے، ظاہر ہے کہ اگر بنی نوع انسان کے کسی ایک حاسہ کی قوت سلب کر لی جائے تو کائنات کا ایک جزو انسان کے دائرہ علم سے خارج ہو جائے گا اور اگر ان پانچ حواس پر کسی اور حاسہ کا اضافہ کر دیا جائے تو معلومات کا ایک نیا باب کھل جائے گا، گویا موجودہ صورت میں ہمارے معلومات

کی دنیا انہی حواسِ خمسہ کے دائرہ کے اندر محصور ہے،

پھر یہ حواس بھی اپنی اپنی جگہ بالکل محدود ہیں، مثلاً قوتِ سامعہ کے ذریعے ہم طرح طرح کی آوازیں سن سکتے ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس قوت کا دارومدار ہمارے پردۂ گوش کی مخصوص ساخت پر ہے، جو آواز کی لہروں سے متاثر ہو کر ان کے احساس کو ہمارے دماغ تک پہنچا دیتی ہے، آواز کی لہریں کچھ تو اتنی شدید ہوتی ہیں کہ ان کی ضرب سے کان کا پردہ پھٹ سکتا ہے، ایسی لہروں کی چوٹ ہم برداشت نہیں کر سکتے، اور جہاں ان کا احتمال ہوتا ہے ہم فوراً اپنے کانوں میں انگلی یا روئی دے لیتے ہیں، اسی طرح دوسری جانب آواز ہلکی ہوتی جائے اور آخر ایک ایسی حد آجاتی ہے، کہ اس کے بعد کان کا پردہ ان لہروں سے اثر پذیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ہم اس آواز کو نہیں سن سکتے، گویا انسان کے کان میں سننے کی ایک حد بندی کر دی گئی ہے، کہ ایک طرف تو وہ مقررہ معیار سے بلند آواز نہیں سن سکتا، اور دوسری جانب مقررہ معیار سے باریک آواز سننے سے قاصر ہے، یعنی اس کائنات کی بے شمار آوازوں میں سے صرف ایک محدود اندازے کی آوازیں انسان کے علم میں آسکتی ہیں، انسان شاید اپنے خیال میں یہی سمجھ لیتا، کہ کائنات کی تمام آوازیں ہیں ہی اتنی، لیکن مشکل یہ ہے کہ خود عقل انسانی نے بعض ایسے ذکی الحس آلات ایجاد کر لیے ہیں، جن سے ایسی آوازیں سنی جا سکتی ہیں جو ویسے پردۂ گوش کی گرفت میں نہیں آسکتیں،

علیٰ ہذا القیاس انسان کی نگاہ کی بھی حد بندی کر دی گئی ہے، چنانچہ خوردبین اور دوربین کی ایجاد نے ثابت کر دیا ہے، کہ زمین اور آسمان میں بے اندازہ ایسے اجسام موجود ہیں، جو ان آلات کی مدد کے بغیر آنکھوں کو نظر نہیں آسکتے، اس سلسلہ میں مطلب کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہو گی، سورج کی سفید روشنی جب منشور مثلث سے گذرتی ہے تو قوس قزح کے سات رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

یہ ساتوں رنگ آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں، اور اسی بنا پہ ایک عرصہ تک یہی خیال قائم رہا کہ سورج کی روشنی سات رنگوں سے مل کر بنی ہے، لیکن بعد کے تجربات نے روشن کر دیا کہ ان سات رنگوں کے علاوہ دو رنگ (الٹرا وائلٹ اور انفرا ریڈ) اور بھی پیدا ہوتے ہیں، جو یوں تو بالکل نظر نہیں آتے، لیکن خاص قسم کی تیار شدہ لوحوں پر صاف دکھائی دیتے ہیں، ان تجربات نے اب سابقہ یقین کو شبہہ سے بدل دیا ہے، کہ سورج کی روشنی سے ان نو رنگوں کے علاوہ شاید کچھ اور رنگ بھی پیدا ہوتے ہوں، جن کا علم مزید آلات کی ایجاد کے بعد ہو سکے، بہر کیف جس طرح ہماری قوتِ سامعہ محدود آوازیں سن سکتی ہے، اسی طرح ہماری قوتِ باصرہ بھی محدود اشیاء کو دیکھ سکتی ہے اور کم و بیش یہی حال باقی حواس کا ہے،

ان حالات میں صاف ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ کی تخلیق کی ہوئی پوری کائنات کا علم ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے، ہمارے حواس اس کائنات کے ایک محدود جزو کو محسوس کر سکتے ہیں اور اسی کو ہم عالم یا جہان سمجھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جس کو ہم جہان کہتے ہیں، وہ خدا کی تمام و کمال کائنات نہیں، بلکہ اس کا ایک محدود جزو ہے، جس کے وجود کا علم ہمیں اپنے مخصوص حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے، ایسی حالت میں کیا یہ دعویٰ بالکل امر واقعہ نہیں، کہ یہ جہان ہمارے ہی خیال کا بت خانہ ہے، کیونکہ اس کا جلوہ ہمارے دیدۂ بیدار پر منحصر ہے، ہم جب بھی کائنات پر نظر ڈالتے ہیں، تو اپنے آپ کو مرکز قرار دے کر ظاہری و باطنی حد نگاہ تک ایک دائرہ کھینچ لیتے ہیں اور اپنے پرکار کے اس حلقے کو "جہان" سمجھتے ہیں، گویا جو کچھ ہمیں نظر آتا، یا حواسِ خمسہ کے ذریعہ محسوس ہوتا ہے، اسے ہم "ہست" جانتے ہیں اور جو کچھ ہمیں نہ نظر آتا ہے اور نہ حواس کے ذریعہ محسوس ہوتا ہے۔ اسے ہم "نیست" ٹھہراتے ہیں یہ تو ہوا مادی دنیا کے متعلق ہمارا احساس اس کے ساتھ ہی ہمیں زمان اور مکان کا

جو تصور ہوتا ہے، وہ ہمارے افکار کی شوخی کے سوا کچھ نہیں، اسی طرح سیر و سکون در غیب و حضور بھی ہمارے اس دل کی فسون کاری کا نتیجہ ہیں، جو ہمارے بھیدوں کا کھولنے والا ہے، غرضیکہ نہ صرف یہ مادی کائنات ہمارے حواس و تخیل کی رہین منت ہے، بلکہ زمان ہماری فکر کی شوخی اور غیب ہمارے دل کی فسون کاری کا نتیجہ ہونے کے باعث دوسرا جہان بھی ہمارے حواسِ باطنی کا ممنون ہے، چونکہ اس جہان کا بویا ہوا اُس جہان میں کاٹا جاتا ہے، اس لیے اُس جہان کے نور و نار بھی ہمارے اسی جہان کے کفر و ایمان کا حاصل ہیں! مختصر یہ کہ ہم تقدیر کے ساز ہیں، اور ہمارے اندر سینکڑوں نغمے چھپے ہوئے ہیں، جہان کہیں بھی خیال کا مضراب پہنچ سکتا ہے۔ وہاں ہمارا ہی تار موجود ہوتا ہے۔

"گلشنِ راز جدید" کے وہ چند اشعار بھی جو "روح اقبال" کے محولۂ بالا ٹکڑے میں پیش کیے گئے ہیں، صاف طور پر اسی تشریح کی تائید کرتے ہیں کہ یہ جہاں رنگ و بو ہمارا گلدستہ ہے، بلحاظ بے جان اور بے حس ہونے کے ہم میں سے بالکل الگ ہے، لیکن ہمارے مدرکات کا نتیجہ ہونے کے باعث ہم سے وابستہ ہے، ہماری خودی نے اسے ایک تار نگاہ کے ساتھ باندھ دیا ہے اور اس طرح زمین و آسمان، چاند اور سورج کی صورت بندی کر دی ہے، ہمارے دل کو اس کے ساتھ ایک پوشیدہ تعلق ہے، کیونکہ ہر "موجود" کسی نگاہ کا ممنون ہوتا ہے، اگر کوئی نہ دیکھے تو اس کا عدم و وجود برابر ہو جائے، اگر دیکھے تو کہیں دریا اور کہیں پہاڑ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یہ جہان ہماری تجلیات کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ ہمارے بغیر نہ روشنی کا جلوہ ہے، نہ آواز کا،

یہاں تک تو اقبال نے اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ یہ دونوں جہان ہمارے ادراک و تخیل کا نتیجہ ہیں، اب اس تمہید کے بعد خالق کون و مکاں کو مخاطب

کر کے سوال کیا ہے کہ تیرا نشان کہاں ہے؟ جب یہ دونوں جہان ہمارے آثار ہیں تو تیرا جہان کونسا ہے؟ سوال نہایت نازک ہے، کیونکہ واقعی جو کائنات ہمارے ہی خیال کا بتخانہ ہو، اس کے مطالعہ سے تو ہمیں خود اپنی ذات کا پتہ چلے گا۔ ایسی محدود کائنات میں خدا کا نشان کیونکر مل سکتا ہے، لیکن شاعر نے بکمال حکمت اسی سوال میں "اے من از تو پایندہ" کا ٹکڑا رکھ کر انسان اور خدا کے تعلق کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا ہے، یعنی انسان نے یہ پہلے ہی بے ساختہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ میرا وجود خدا کے فیض سے قائم ہے، یہ مان لینے کے بعد انسان کے فکر و خیال کے پیدا کردہ جہان بھی بالواسطہ خدا ہی کے فیض کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں، لیکن شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کو اس مادی کائنات کے اندر تلاش کرنا بے حاصل ہے کیونکہ یہ مادی کائنات ہمارے ہی پندار کا صنم خانہ ہے اس مادی کائنات سے تو انسان کے وجود کا پتہ چلتا ہے، ہاں جب انسان اپنے نفس کا مطالعہ کرے تو یہاں سے اسے خدا کا سراغ مل سکتا ہے، گویا یہ کائنات تو انسان کا جہان ہے اور انسان کی خودی کا عالم خدا کا جہان، اس مضمون کو اقبال نے بہت سے مقامات پر مختلف انداز سے ادا کیا ہے مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں

زانجم تا بہ انجم صد جہاں بود — خرد ہر جا کہ پرزد آسماں بود
ولیکن چوں بہ خود نگریستم من — کرانِ بیکراں در من نہاں بود

ذیل کے شعر میں تو مضمون کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ شبہہ و تاویل کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، انسان کائنات کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے۔

عالمِ آب و خاک و باد! سرِّ عیاں ہے تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں

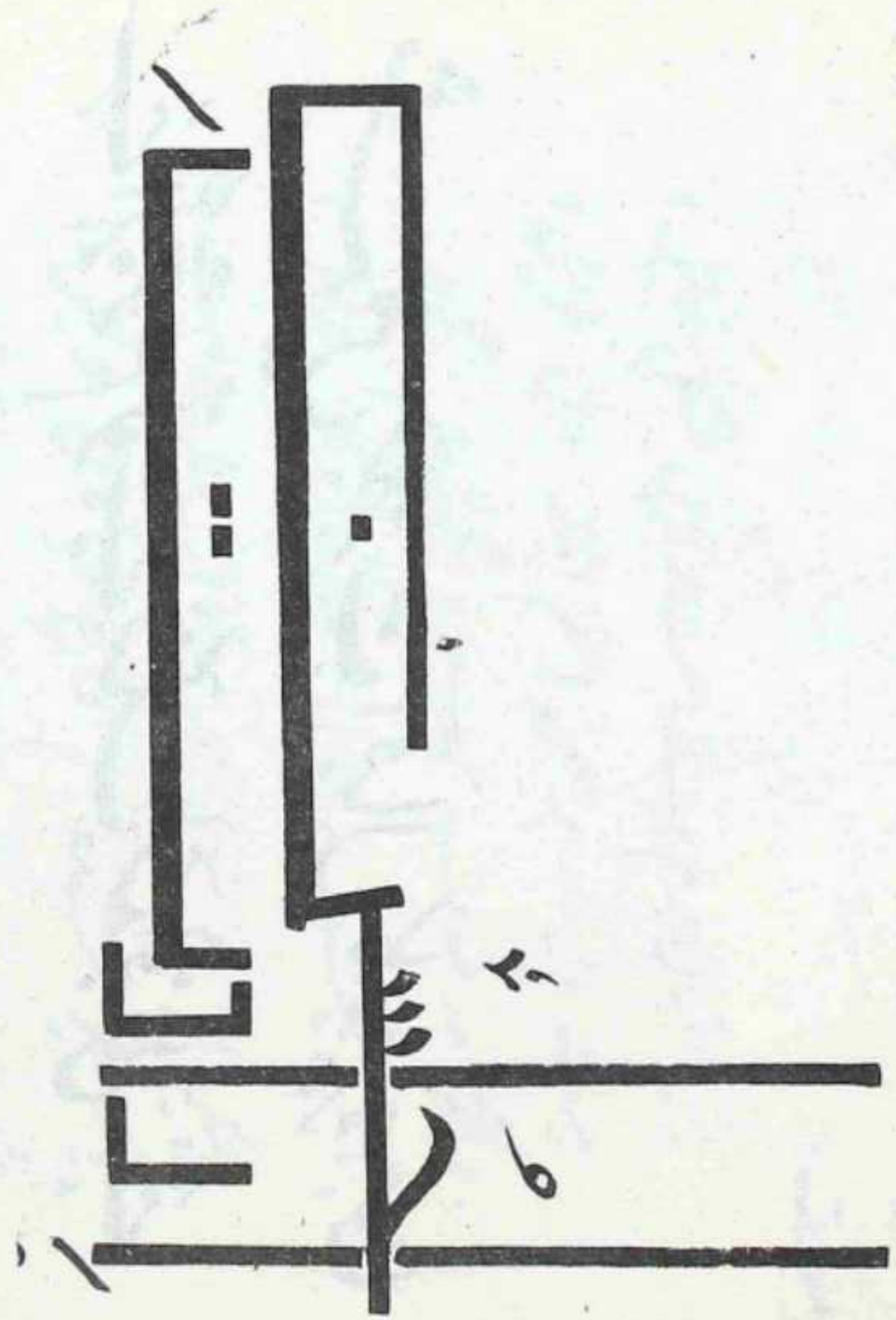

Scanned with CamScanner

شعر میں حضرتِ اقبال کا پیرو ہونا
ہے اگر جرم تو بے شک اسد اقبالی ہے

Scanned with CamScanner

سوال بہ اقبال

شاعر کو ڈاکٹر سر اقبال کے اسرارِ خودی پڑھ کر جو شکوک پیش آئے ہیں وہ موزوں نغموں میں ادا ہوئے ہیں۔ صوفیانہ مثنوی "گلشن راز" کا وجود اسی طرح ہوا ہے۔ کیا ہمارے شاعر کے یہ شکوک ہمارے باکمال فلسفی شاعر کو ایک نئے گلشن راز کے کھلانے کی طرف متوجہ نہ کریں گے۔ (معارف)

پیشِ اقبال برم اے اسد ایں مشکلِ خویش؟
ہست دل در برِ من یا منم اندر دلِ خویش؟
ریختم در صدفِ جسم و بگشتم گوہر
یا نیم بیشتر از حاصلِ آب و گلِ خویش؟
پیکرِ از روشنیٔ من مہِ کامل شدہ است
یا بہ پیکر شدہ ام داغِ مہِ کامل خویش؟
مثل مجنوں ہمہ تن جلوۂ عریاں باشم
یا چو لیلیٰ بشوم روشنیٔ محملِ خویش؟
بہرِ گوہر بزنم غوطہ بدریائے وجود؟
یا بہ کشتی بروم در طلبِ ساحلِ خویش؟
باید اول کہ بخواہم دلِ دانا ز خدا
یا ازاں پیش خدا را طلبم از دلِ خویش؟
بہ تلاشِ خضرِ عشق، جنوں درکار است؟
یا خرد را بکنم راہبرِ منزلِ خویش؟
دارم امید کہ آں فلسفیٔ صاحب دل
بکشاید بہ کرم عقدۂ ایں سائل خویش! (معارف۔ فروری ۱۹۳۱ء)

اقبالؒ

(یہ نظم ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور میں دی انٹر کالجیٹ مُسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔)

شاعروں سے ہے بہت اونچا مقام اقبال کا
کیونکہ ہم آہنگِ قرآں ہے کلام اقبال کا

ذہنِ ہندی، علمِ افرنگی، نگاہِ یثربی
ہے محیطِ مشرق و مغرب نظام اقبال کا

بڑھ گیا رازی سے اور پھر رازدارِ دیں بھی ہے[1]
کیوں نہ ہو رومی ہی جب ٹھیرا امام اقبال کا

جو وظیفہ دیدہ و دل کا ہے جسمِ فرد میں
ہے وہی کچھ پیکرِ ملّت میں کام اقبال کا

عصرِ لادینی میں رکھا رایتِ دیں کو بلند
کیوں نہ چمکے مثل مہر و ماہ نام اقبال کا

تیرے دل کو تیری نظروں کو بدل کر رکھ دیا
کیا ترے نزدیک کچھ کم ہے یہ کام اقبال کا

---

[1] مولانائے رُوم کا مشہور شعر ہے۔ ؎ گر بہ استدلال کارِ دیں بُدے
فخر رازی رازدار دیں بُدے

یہ جو ملّت میں نظر آتے ہیں آثارِ حیات
ان میں بھی ہے کار فرما فیضِ عام اقبال کا
اُمتِ مرحوم کو دے کر سراغِ زندگی
کر گیا کارِ مسیحائی پیام اقبال کا
شعلہ در آغوش ہیں غنچے ریاضِ قوم کے
ہو رہا ہے جلوہ گر سوزِ تمام اقبال کا
جاگ اٹھا اس کی نوا سے سبزۂ بیگانہ بھی
گوشِ گل ہی تک نہیں پہنچا پیام اقبال کا
خاکیوں میں کر دیا ہے تازہ پھر عشق رسولؐ
قدسیوں کے دل میں بھی ہے احترام اقبال کا
آستانِ مصطفےٰؐ پر سجدۂ فکرِ بلند
ہے زبانِ اہلِ معنیٰ میں کلام اقبال کا
اے اسدؔ محفل سہی کوتاہ دست و کم طلب
تندیٔ صہبا سے ہے گردش میں جام اقبال کا

(منقول از مرثیۂ اقبال۔ ص ۲۷)

مرثیۂ اقبال

جناب اسد ملتانی کی یہ طویل نظم حضرت علامہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد ۱۹۳۸ء ہی میں ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر "چند الفاظ" کے نام سے جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی۔ اے کا لکھا ہوا دیباچہ بھی ہے۔ اس دیباچہ کی تاریخ تحریر یکم جون ۱۹۳۸ء ہے۔ دیباچہ کا متن اور نظم درج ذیل ہیں۔

چند الفاظ

حضرت علامہ علیہ الرحمتہ نے فرمایا ہے کہ بربطِ ہستی کے بہت سے خوابیدہ نغمے مضرابِ غم سے بیدار ہوتے ہیں اس حقیقت کی تفسیر آپ کو پیشِ نظر مرثیہ میں ملے گی۔

محترمی جناب اسد ملتانی کے کلام میں ندرتِ فکر سلاستِ بیان کے ساتھ ساتھ بلند نگاہی، حقائق پروری، شاعِ امید کی تابندگی اور جوشِ عمل کی حرارت کی وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوتی ہیں جو ایک حقیقی اسلامی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اثر و درد اور سوز و گداز کے یہ المیہ جذبات فطرت نے ان کے قلب کی گہرائیوں میں شاید اسی قیامت صغریٰ کے لیے چھپا کر رکھے تھے جس نے آج تمام عالم اسلامی کو یوں سیاہ پوش بنا رکھا ہے۔

محسوسات کے خوگر انسان کی نگاہیں بالعموم پردہ ہائے مجاز کی رنگینیوں میں محوِ تماشا ہو کر رہ جاتی ہیں اور اس طرح وہ عروسِ حقیقت کے حسنِ بسیط سے بہت کم بہرہ یاب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے عام طور پر حضرتِ علامہؒ کو ایک شاعر ہی سمجھا اور شاعر ہی کی حیثیت سے ان کا ماتم کیا۔ حقیقت بیں نگاہیں ڈھونڈتی تھیں کہ وہ "محرم راز" بھی کہیں ہے جو ان پردوں کے نقش و نگار سے گزر کر اقبال کے صحیح مقام تک پہنچ چکا ہو۔ نگاہیں اٹھتی تھیں اور مایوس ہو کر لوٹ آتی تھیں۔ جناب اسد مستحقِ سپاس و امتنان ہیں کہ انہوں نے نگاہِ شوق کی حسرت

کو طمانیت سے بدل دیا۔

اقبال کا مرثیہ درحقیقت عالم اسلامی کی بیکسی اور یتیمی کا مرثیہ ہے اور اسے وہی شخص لکھ سکتا تھا جس کی انگلیاں نبضِ ملت پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہوں جس کا دماغ حقائق قرآنی سے منور اور قلب دردِ ملّی سے لبریز ہو۔ یہ توفیق حلقۂ اقبال ہی کے کسی رندِ سرشار کا حصہ تھی اور ظاہر ہے کہ جناب اسد سے بڑھ کر اس سعادت کا مستحق اور کون ہو سکتا تھا؟

سب سے بڑی خصوصیت جس کی وجہ سے یہ مرثیہ ایک انفرادی شان کا حامل ہو رہا ہے یہ ہے کہ اس سے اظہارِ غم سے زیادہ پردہ داریٔ غم مقصود ہے اور اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ آنکھ کے آبگینے میں جھلکتے ہوئے آنسوؤں کو مینائے قلب میں لوٹا کر لے جانا اور یوں آبروئے ضبط کو پامال نہ ہونے دینا کچھ آسان کام نہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ جناب اسد کو باوجود اختیار اپنے دل پر اس قدر جبر کیسے حاصل ہے؟

پھر یہ چیز بھی قابلِ دید ہے کہ سحابِ غم میں سے گذرتی ہوئی شعاعِ امید ذہنی افق پر جو نمناک لیکن درخشندہ قوسِ قزح پیدا کر رہی ہے وہ مرثیہ کی دنیا میں غالباً پہلی چیز ہے۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ لیکن یہ مرثیہ وہ ہے جو حضرت علامہ کی بارگاہ میں اردو شاعری کی تہی دامنی اور کم مائیگی کا کفّارہ ادا کرے گا اور کیوں نہ ہو ع

کہ اصلِ ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی ست

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ جناب اسد نے سب سے پہلے یہ مرثیہ مجھے سنایا اور میرے ہی تقاضائے شوق پر انہوں نے اسے "طلوعِ اسلام" میں اشاعت کے لیے مرحمت فرما دیا۔ یہ چند الفاظ ان تاثرات کا نہایت ناکام سا ذریعۂ اظہار ہیں جو اس مرثیہ نے میرے دلِ دردآگیں پر چھوڑے ورنہ جو کچھ دل میں ہے اسے تو ع

دل داند و من دانم و داند دلِ من

پرویز شملہ یکم جون ۱۹۳۸ء

الٰہی کیسی قیامت کی یہ سحر آئی
جو آج رحلتِ اقبالؒ کی خبر آئی

وفاتِ شاعرِ مشرق کی اطلاع ملی
کہ روح و قلب میں برقِ بلا اُتر آئی

زمانہ ہو گیا آنکھوں میں ایسا تیرہ و تار
کہ زندگی میں جھلک موت کی نظر آئی

خدا کرے کہ غلط ہو یہی تھی خواہشِ دل
خبر اگرچہ نہایت ہی معتبر آئی

ہزار حیف دعا کوئی کارگر نہ ہوئی
دُعا فلک پہ گئی اور بے اثر آئی

ہمارا گنجِ گراں مایہ اس کے ہاتھ لگا
لُٹے جو ہم تو قضا کی مُراد بر آئی

سیاہ روز ہوئی آج ملّتِ بیضا
کہ شامِ غم سے بھی اک تیرہ تر سحر آئی

امامِ فلسفہ و شاعری کا ماتم ہے
مہِ صفر بھی ہمارے لیے محرّم ہے

جو کائنات مسخر بھی ہو تو کیا حاصل
نہیں ہے موت پہ انساں کا اختیار افسوس

نہیں ہے ہستیٔ موہوم کا یقیں کچھ بھی
نہیں ہے عمرِ دو روزہ کا اعتبار افسوس

روانہ ہو گیا ملّت کے باغ ویراں سے
خزاں کے دور کا پیغمبرِ بہار افسوس
بھڑکنے پائی نہ اس کی نوا سے آتشِ گُل
کہ جل کے رہ گئی خود عندلیبِ زار افسوس
چمن میں ایک نئے دور کا کیا آغاز
اور آپ چل دیا افسوس صد ہزار افسوس
ابھی نہ آیا تھا ان گلبنوں پہ رنگِ بہار
جنہیں وہ کرتا تھا اشکوں سے آبیار افسوس
خود اپنی آنکھوں سے وہ فصلِ گل نہ دیکھ سکا
تمام عمر کیا جس کا انتظار افسوس
جو بعد مرگ ملا عیش کا پیام تو کیا؟
پس از اجل ہوا محفل کا اہتمام تو کیا؟

کمی نہیں ہے زمانے میں رہنماؤں کی
مگر وہ راہنماؤں کا رہنما نہ رہا
زمانہ کانپتا تھا جس کی بے نیازی سے
وُہ مردِ مومن و درویشِ بے نوا نہ رہا
کھلے نہ اس کے مقامات اہلِ ظاہر پر
کہ انجمن میں وہ عارف قلندرانہ رہا
کرے گا اب دلِ یزداں بھی یہ کمی محسوس
کہ ایک "بندۂ گستاخ" لب کشا نہ رہا

تھا جس کا زمزمہ غالب نوائے فطرت پر
جہاں میں آج وہ شاعر غزل سرا نہ رہا
جہاں کو شعرِ دل آویز کے بہانے سے
سُنا رہا تھا جو پیغامِ آشنا نہ رہا
بجھا دل ایسا کہ اقبال کی وفات کے بعد
اسد مرے لیے جینے میں کچھ مزا نہ رہا

ذرا بھی جی نہیں لگتا جہانِ فانی میں
خلا سا ہوتا ہے محسوس زندگانی میں

تجھے خُدا نے جو واپس بلا لیا اقبال
ترے پیام کی تکمیل ہو گئی ہو گی
اب آسماں تری آمد کے منتظر ہوں گے
زمیں پہ تیری ضرورت نہیں رہی ہو گی
جہان اور جو آگے ہیں ان ستاروں سے
وہاں طلب ترے فکرِ بلند کی ہو گی
جو پڑ گئی ہے ضرورت تری نواؤں کی
فضائے خلد کے نغموں میں کچھ کمی ہو گی
ہم ایسی باتوں سے دل کو ہزار بہلائیں
مگر نہ دور طبیعت کی بیکلی ہو گی
مٹے گا داغ نہ دل سے تری جُدائی کا
خلش نہ کم ترے دردِ فراق کی ہو گی

میں تجھ سے چند مہینے ہوئے کہ مل آیا
خبر نہ تھی یہ ملاقات آخری ہوگی

کہاں کرائے گی "جاوید منزل" اب تری دید
کہ تو نے جا کے بسالی ہے منزلِ جاوید

ترا مقام تو ہے شاعری سے بالاتر
ہے تیری ذات پہ البتہ شاعری کو ناز
یہ شاعری ہے کہ شعر و سخن کے پردے میں
خودی کی جلوہ نمائی خدا سے راز و نیاز
دلوں کو دے جو نئی زندگی وہ درد و اثر
کرے جو روح کی نشو و نما وہ سوز و گداز
نگاہ جاتی ہوئی کائنات کے دل تک
سخن پہنچتا ہوا تا بہ سرحدِ اعجاز
بہت طویل زمانے کے بعد آیا تھا
فضائے ہند میں اک موجۂ نسیم حجاز
شمیم بیز، دل آویز اور جنوں انگیز
ولیک حیف! بہت تیز اور سبک پرواز
جو اس قدر سفر آخرت میں جلدی کی
تھا تیرے واسطے کارِ جہاں بس اتنا دراز؟

کسی کو اور کرانا تھا انتظار ابھی
کچھ اور دن اسے رکھنا تھا بے قرار ابھی

یہ کیا قضا و قدر کی ستم ظریفی ہے
اسیرِ دامِ اجل شاعرِ حیات ہوا
نہیں، اک اور جہاں کی تلاش میں شاید
رواں وہ طالبِ اسرارِ کائنات ہوا
جو مطمئن نہ ہوا جلوۂ صفات سے وہ
تو رہ نورد بسوئے حریمِ ذات ہوا
حیات کے حرمِ پاک میں وہ اب بھی ہے
فنا کا بتکدہ محرومِ التفات ہوا
کہا "میں موت سے ڈرتا نہیں مسلماں ہوں"
بوقتِ نزع بھی ثابت ترا ثبات ہوا
خوشی سے خُلد میں جا اے رسول کے عاشق
یہ عشق تیرے لیے ضامنِ نجات ہوا
ترے تو گوشۂ مرقد میں روشنی ہوگی
مگر ہمارے لیے آہ دن بھی رات ہوا

ہوا جہاں میں یکایک یہ انقلاب افسوس
غروب ہوگیا مشرق کا آفتاب افسوس

بہت دنوں سے یہاں عارفانِ صاحب دل
نہ مسجدوں میں تھے باقی نہ خانقاہوں میں
جو تھے فقیر تو رہبانیت کے گوشہ نشیں
جو تھے امیر تو شاہوں کی بارگاہوں میں

ترے وجود نے اک بار کر دیا تازہ
زمانہ رومی و رازی کا پھر نگاہوں میں
کبھی جو تھی دل رومی سے عقلِ رازی سے
وہ روشنی نظر آئی تری نگاہوں میں
ترے کلام نے توڑا فرنگ کا وہ فسوں
سراغِ زیست دکھاتا تھا جو گناہوں میں
کلیم و خانۂ فرعون کی مثال ہوئی
وہ تربیت تری مغرب کی درسگاہوں میں
صراطِ عشق پہ تو نے لگا دیا ان کو
بھٹک رہے تھے جو عقل و ہوس کی راہوں میں
یہ رمز ہے شعرا پر تری فضیلت کی
دلوں میں ہے تری عظمت بھی اور محبت بھی

وہ شعر و فلسفہ کا بحرِ بیکراں اقبال
جنونِ عشق و محبت کا رازداں اقبال
وہ فلسفے میں خودی کا پیامبر اقبال
وہ شاعری میں حقیقت کا ترجماں اقبال
وہ جسمِ قوم میں مثلِ دماغ و دیدہ و دل
وہ روحِ فطرتِ اسلام کی زباں اقبال
یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پا گیا ہے وفات
وہ میرا مرشد و استادِ مہرباں اقبال

نہیں نہیں کبھی اقبال مر نہیں سکتا
سپرد خاک ہوا جو وہ ہے کہاں اقبال
وہ کر رہا تھا کئی دن سے اس میں در پیدا
گیا نہ عاقبت "آں سوئے آسماں" اقبال
دلوں میں تا بہ قیامت رہے گی یاد اس کی
اگرچہ آج نگاہوں سے ہے نہاں اقبال

جناں میں اس کا قیام اور جہاں میں اسکا کلام
دوگونہ ہو گئی حاصل اسے بقائے دوام

نظر ہے کتنی ہی محدود و نا رسا ان کی
جنہیں گماں ہے کہ اقبال سخت کوش نہ تھا
شعاعِ مہر کی صورت حیات پرور تھا
عجب نہیں جو بظاہر وہ گرم جوش نہ تھا
نسیمِ صبح کے مانند تھا وہ غنچہ کشا
تباہ کاریٔ طوفانِ پُر خروش نہ تھا
اسی کی مے کا اثر تھا یہ سب اگرچہ وہ خود
شریکِ شورشِ رندانِ بادہ نوش نہ تھا
خریدنا اُسے چاہا جہاں نے بہتیرا
مگر وہ بندۂ آزاد خود فروش نہ تھا
تمام زندگی اس کی تھی اک جہادِ عظیم
وہ گرچہ تیغ بدست و کفن بدوش نہ تھا

نگاہِ اہلِ محبت میں تھا ولی اقبال
کمی جو تھی تو یہی تھی کہ خرقہ پوش نہ تھا

اگرچہ آج جہاں سے گزر گیا اقبال
جو کام کرنے کو آیا تھا کر گیا اقبال

وہ خود نہیں مگر اس کا پیام باقی ہے
وہ چپ ہوا مگر اس کا کلام باقی ہے
وہ آسماں کی طرف اڑ گیا مگر اس کا
زمینِ شعر پہ نقشِ دوام باقی ہے
اگرچہ میکدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی
وہ مے وہ خُم وہ صراحی وہ جام باقی ہے
جو رہ گئی ہے رگِ تاک میں وہی نہ سہی
کھچی ہوئی تو مئے لالہ فام باقی ہے
وہ مردِ پاک نظر جس کی طرح ڈال گیا
ابھی وہ کام بہت نا تمام باقی ہے
وہ جس نظام کی رکھتا تھا آرزو دل میں
بہت کچھ اُس کا ابھی انتظام باقی ہے
اگرچہ صدمہ ہے صبر و ثبات سے بڑھ کر
سنبھالو ہوش کہ دنیا میں کام باقی ہے

کہیں نہ جوشِ عمل سیل اشک میں بہہ جائے
جو بات کہہ گیا اقبال وہ یونہی رہ جائے

اُٹھو مقابلۂ گردشِ زمانہ کریں
حیات و موت کو پابستۂ قضا نہ کریں

فنا یہی ہے کہ دل میں نہ ہو یقینِ بقا
بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں

عجب نہیں کہ یہی بجلیاں حوادث کی
ہمارے توسنِ ہمت کو تازیانہ کریں

اسی سے ملّتِ خوابیدہ جاگ اٹھے شاید
وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں

نہ مل سکا طلبِ نیم گرم سے کچھ بھی
اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں

جمالِ یار تو بیتابِ خود نمائی ہے
پہ اہلِ دل بھی تو پیدا کوئی بہانہ کریں

اسی لیے ہو اسدؔ رفعتِ جبیں کی طلب
کہ سجدہ کر کے بلند اُن کا آستانہ کریں

یہی ہے حضرت اقبال کا پیامِ حیات
اسی پیام سے حاصل کریں دوامِ حیات[1]

---

[1] نظم کے اس آخری بند کے پہلے سات شعر حضرت علامہ اقبال کی زندگی ہی میں ماہنامہ طلوعِ اسلام کے فروری ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں شائع ہوئے تھے۔ (جعفر)

غمِ اقبال

دیدۂ اشکبار کو اور نہ اشکبار کر
ملّتِ غم رسیدہ اب صبر بھی اختیار کر

پھول کی آنکھ بھی ہے تر چشمِ ستارہ بھی ہے نم
شاہدِ کائنات کو اور نہ سوگوار کر

کوند کے موجِ اشک میں ڈوب نہ جائے برقِ غم
شعلۂ مستقل بنا دل میں اسے اتار کر

ماتمِ عارضی کا رخ جانبِ عشق پھیر دے
سوزِ غمِ فراق سے درد کو پائیدار کر

جو کہ رموزِ سروری تجھ کو بتا کے چل دیا
ویسے فقیر کے لیے صدیوں اب انتظار کر

پردۂ مرگ نے اُسے تجھ سے چھپا لیا تو کیا
اپنی حیاتِ عشق میں تو اسے آشکار کر

ہے یہی ماحصل اسد اس کے پیامِ خاص کا
عشق سے زندہ کر خودی، فقر سے استوار کر

(از مرثیہ اقبال، ص ۲۵)

مقصودِ اقبال

یہ نظم "طلوع اسلام" کے مئی ۱۹۳۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ نظم سے پہلے یہ نوٹ ہے۔

"یہ اشعار مجلس مرکزیہ یوم اقبال لاہور کے منعقد کردہ "یوم اقبال" مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کے لیے لکھے گئے۔ یہ محض تخیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے واقعہ کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے نظم یوم اقبال کی تقریب پر پڑھی گئی اور نشر بھی ہوئی۔"

کہا اقبالؒ سے اک ہمنشیں نے
سخن تیرا شراب آتشیں ہے
کچھ اس انداز سے گرما دیئے دل
کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے
حرارت ہے ترے سوزِ نوا کی
کہ بجلی سی دلوں میں جاگزیں ہے
کلامِ شاعراں پروردۂ عصر
مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے[1]
اثر میں ہے یہ صورِ محشر انگیز
کشش میں نغمۂ خلدِ بریں ہے
بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا
دل اب طرزِ کہن پر نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے!
یہ سن کر حضرت اقبال بولے
فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے
زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا
فلک وہ ڈھونڈ جس کی یہ زمیں ہے
مرے فکرِ فلک پیما کی پرواز
ادب پروردۂ روحِ الا میں ہے
فروغِ عشق و سوزِ آرزو سے
سخن میرا تب و تاب آفریں ہے
مگر میرے سخن کی روشنی بھی
"چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے"
مرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا
اگر تو سالکِ راہِ یقیں ہے
تری نظروں میں ہیں میری تصانیف
مری نظروں میں قرآنِ مبیں ہے
گزر جانا مری بزمِ سخن سے
رہِ قرآں میں گامِ اوّلیں ہے
جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے
تو حاصل دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائناتِ دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

لہ جناب عبدالشکور احسن نے جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے شمارہ جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون بعنوان IQBAL'S GROWING IMAGE IN IRAN میں بتایا ہے کہ ایران کے ملک الشعرا بہار (متوفی ۲۱-اپریل ۱۹۵۳ء) نے اقبال کی ساتویں برسی (۱۹۴۵ء) کی تقریبات کے دوران میں اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا ؎

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدی کز صد ہزاراں بر گزشت

لیکن جناب اسد حضرت اقبال کی عصر آفرینی کا اعتراف بہار کے متذکرہ اظہار خیال سے برسوں پہلے یعنی ۱۹۳۹ء میں فرما چکے تھے۔ (جعفر)

یادِ اقبالؒ

نہیں اٹھتی کوئی پُر درد صدا تیرے بعد
ہو گیا قافلہ محرومِ درا تیرے بعد

جس کی فریاد سے نیندوں میں خلل پڑ جائے
نہیں ایسا کوئی آشفتہ نوا تیرے بعد

نظر آتے ہیں بدن زندگیوں کے مدفن
پھر یہاں کون کرے حشر بپا تیرے بعد

فلسفہ خاک بسر ہے ترے اٹھ جانے پر
شاعری ہے ہمہ تن آہ و بکا تیرے بعد

نہ رہا عقل و جنوں میں وہ توازن قائم
علم پھر عشق سے بیگانہ ہوا تیرے بعد

غلطی پر جو کوئی ٹوکنے والا نہ رہا
کھو گئے بولہبی میں علماء تیرے بعد

ان کے پردوں سے گزر سکتی ہے اب کس کی نظر؟
مطمئن پھرتے ہیں اربابِ ریا تیرے بعد

ہے کوئی محوِ کلیسا، کوئی وارفتۂ دیر
محرمِ رازِ حرم مل نہ سکا تیرے بعد

یہ بھی ہے تیری نواؤں کا اثر جس کے سبب
قبلہ رُو "رہبر فرزانہ" ہوا تیرے بعد

یہ صداقت کا کرشمہ ہے کہ تیرا پیغام
جذب و تاثیر میں کچھ اور بڑھا تیرے بعد

تیرے ہوتے جسے کہہ دیتے تھے شاعر کا خیال
قوم کا قبلۂ مقصود بنا تیرے بعد

(طلوعِ اسلام۔ مارچ ۱۹۴۰ء)

شعرِ اقبال

جناب اسدؔ نے یہ نظم ۲۱ اپریل کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈ کاسٹ کی اور باخذِ اجازت شائع کی جاتی ہے۔ (طلوع اسلام)

شاعر اک نغمۂ رنگیں جو سنا دیتا ہے
جامِ مے کان کے رستے سے پلا دیتا ہے
عیش و آرام کے دامن میں دکھا کر رحمت
روح کو جسم کی تربت میں سلا دیتا ہے
زندگی میں نہ رہے کچھ بھی حرارت باقی
اشکِ حسرت سے دل اس طرح بجھا دیتا ہے
ہے دمِ سرد تو کیا اور نفسِ گرم تو کیا؟
شعلۂ تندِ ہوس ہی کو ہوا دیتا ہے
کھیلتا ہے فقط ابھرے ہوئے جذبات کیساتھ
ان کی تیزی کو ذرا اور بڑھا دیتا ہے
اہلِ محفل کے خیالات کے رخ پر تو
اپنے الفاظ کے پردے میں سجا دیتا ہے
پھر عجب کیا ہے جو ٹھہرے یہ سخن کا معیار
شعر اچھا ہی وہی ہے جو مزا دیتا ہے
مختلف ہے مگر اقبال کا اندازِ سخن
شاعری کو وہ حقیقت سے ملا دیتا ہے

ذوقِ تفریح و تفنن سے اسے کرکے بلند
شعر کو لازمۂ زیست بنا دیتا ہے
ممکناتِ دلِ انساں کو نمایاں کرکے
اک نیا ولولۂ نشو و نما دیتا ہے
ڈال کر سوزِ تمنا کی کوئی چنگاری
سرد سینے میں بھی اک آگ لگا دیتا ہے
دہر کے رنج و الم ہیچ نظر آتے ہیں
دل کو ایسا غمِ اندوہ رُبا دیتا ہے
موت کا خوف ہی دل میں نہیں رہتا باقی
ایسے انداز سے پیغامِ بقا دیتا ہے
کرکے انساں میں احساسِ خودی کو بیدار
دل کی سوئی ہوئی قوت کو جگا دیتا ہے
فلسفے کو وہ بناتا ہے محبت کا غلام
عقل کو عشق کے رستے پہ لگا دیتا ہے
پیکرِ خاک کو دیتا ہے شعورِ انساں
اور پھر انساں کو مسلمان بنا دیتا ہے

(طلوعِ اسلام مئی ۱۹۴۱)

جناحؒ و اقبالؒ

قائدِ اعظم جونہی فردوس میں داخل ہوئے
حضرت اقبال آئے ان کے استقبال کو
قائدِ اعظم نے ملتے ہی بغل گیری کے بعد
کامیابی پر مبارکباد دی اقبال کو
سُن کے یہ اقبال بولے آفریں ہو آپ پر
آپ ہی نے کر دکھایا حال میرے قال کو
میں نے تو ظاہر کیا تھا اک خیال اور آپ نے
جامۂ تفصیل پہنایا مرے اجمال کو
آپ کی عقل جنوں پرور کا اعجاز تھا
رفع کرنا دوست اور دشمن کے ہر اشکال کو
کامیابی سے نوازا ہے خدائے پاک نے
آپ کے صدق و خلوص و عزم و استقلال کو
آپ نے تو کر دیا بے شبہ فرض اپنا ادا
دیکھنا ہے اب مسلماں کے مقام و حال کو
توڑ پھینکا اس نے افرنگی کا ذہنی دام بھی
یا ابھی چھوڑا ہے صرف اس کے سیاسی جال کو
کاش یہ اللہ کے حبلِ متیں کو تھام لے
چھوڑ کر افرنگ کے بازیچۂ اطفال کو
رکھ کے یہ قرآن و سنت کو نظر کے سامنے
لائے اس معیار پر افکار اور اعمال کو
جلد پاکستان میں جاری ہو اسلامی نظام
تاکہ اطمینان حاصل ہو دلِ اقبال کو

(طلوع اسلام نومبر ۱۹۴۸ء)

کارنامۂ اقبال

یہ نظم ۲۴ اپریل ۱۹۴۹ء کو یوم اقبال کے موقع پر پڑھی گئی۔ اور کراچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی۔

شاعر کے تخیل کی تاثیر نظر آئی
اک مملکتِ نو کی تعمیر نظر آئی
اب صورتِ آئینہ روشن ہے وہی عالم
جس کی کبھی دھندلی سی تصویر نظر آئی
جو خواب کہ دیکھا تھا اک مرد قلندر نے
اس خواب کی کیا دلکش تعبیر نظر آئی
کیسا دلِ دانا تھا، کیا دیدۂ بینا تھا
فاش اس کو مسلماں کی تقدیر نظر آئی
مومن کی فراست میں پرتو ہے مشیت کا
تدبیر میں تنویرِ تقدیر نظر آئی
کس سے یہ اسیروں نے آدابِ جنوں سیکھے
اک جست میں دو ٹکڑے زنجیر نظر آئی
دنیا پہ ہوا ظاہر تب زورِ قلم اس کا
جب قوم کے قبضے میں شمشیر نظر آئی
محفل نے اسدؔ جس کو شاعر کا سخن سمجھا
اس میں ہمیں قرآں کی تفسیر نظر آئی

(طلوع اسلام۔ مئی ۱۹۴۹ء)

یومِ اقبال

یہ کھیل کیا ہے کہ "اقبال" بن گیا اک بال
ہر ایک طفلِ دبستان جسے رہا ہے اُچھال
جہاد اس کا تھا جس طرزِ شاعری کے خلاف
اسی سے گونج رہا ہے مشاعرے کا حال
کہیں یہ رنگ کہ اس کا کلام بادف وچنگ
سُنا رہے ہیں گویّے، طوائفیں، قوّال
بس ایک مشغلہ دلچسپ مل گیا ہے ہمیں
کہ اس کا یوم مناتے ہیں دھوم سے ہر سال
غرض نہیں ہے کچھ اس سے کہ کیا کہا اُس نے
ہے صرف دادِ کلام اور اعترافِ کمال
ہے اس کے فکر پہ فخر اور اس کے نطق پہ ناز
مگر قبول نہیں پھر بھی اس کا استدلال
سنائے نغمۂ دلکش تو شاعرِ اعظم
کرے جو ذکرِ خدا و نبی تو کہنہ خیال
یہ کیا مذاق ہے اقبال کے کلام کے ساتھ
خلافِ مقصدِ قرآں ہے اس کا استعمال
جو ہو مطابقِ خواہش تو حکمت والہام
جو ہو خلافِ طبیعت تو شاعرانہ خیال
وہ جس کو فتنۂ مغرب قرار دیتا ہے
ہم آج اس کو سمجھنے لگے دلیلِ کمال
ہے ذکرِ پردۂ نسواں پہ کیا عجیب جواب
سمجھ سکا نہ وہ بیچارہ یہ دقیق سوال

جو وہ حکومتِ حق کا پیام پہنچائے
تو ہم کہیں کہ ہے اس دور میں یہ امرِ محال
وہ جتنے درد سے دیتا ہے درسِ خودداری
ہم اور بنتے ہیں اہلِ فرنگ کے نقّال
ہزار دیدہ وروں میں نظر نہیں آتی
نگاہ بندۂ مومن کی ایک زندہ مثال
اک آدمی بھی ہے اقبال آشنا اس میں ؟
بہت بجا سہی اقبال اکادمی کا خیال
کوئی یہ مجلسِ دستور ساز سے پوچھے
کہ سامنے کبھی آیا ہے اس کے یہ بھی سوال
وہ جس کے خواب کی تعبیر ہے یہ پاکستان
نظام ملک کے بارے میں کیا تھا اسکا خیال ؟
کبھی خود اس کی تصانیف میں بھی ڈھونڈا ہے
کہ مل سکے کوئی تفصیل یا کوئی اجمال
کیا تھا اس نے کہیں ان میں رائے کا اظہار
کئے جو قائدِ اعظم کے نام خط ارسال ؟
یہ خوب ہے کہ تصور تو اس سے لیتے ہیں
مگر بناتے ہیں تصویر کے نئے خدوخال
یہ کس کو حق ہے کہ موجد سے چھین کر ایجاد
کسی جدید نمونے پہ لے اسی کو ڈھال ؟

خیال جس نے دیا اس کی بات بھی نہ سنیں
نہیں ہے کیا یہ اک احساں فراموشی کی مثال؟
ہوئی ہے قوم کو آخر یہ کس طرح جرأت
کہ اس فقیر کی سب حسرتیں کرے پامال
اسدؔ جو یوم ہے اقبال کا تو حق یہ ہے
کہ آج قوم کرے اپنے جرم کا اقبال

طلوع اسلام اپریل ۱۹۵۰ء

کلامِ اقبالؒ کا انگریزی ترجمہ

سُنا ہے حضرتِ اقبالؒ کے افکارِ عالی کو
ہیں انگریزی زباں میں ڈھالنے کی کوششیں جاری
خیال اچھا ہے اس سے حق ادا ہوتا ہے شاعر کا
کہ روشن ساری دنیا پر ہو اس کی شعلہ گفتاری
مگر یہ بات رہ رہ کر مرے دل میں کھٹکتی ہے
یہ آخر کس لیے ہونے لگی غیروں کی غمخواری
دُرِ یکدانہ اپنا ہم کریں نذرِ قباد و جم
یہ فیاضی ہے یارب یا طلسمِ ہیچ مقداری
جو اس جنسِ گراں مایہ کو باہر بھیجتے ہیں ہم
خود اپنے ملک میں کیا ہو گیا قحطِ خریداری
جسے سیراب کرنا تھا ہماری کشتِ ویراں کو
سمندر پار ہو اس ابرِ نیساں کی گہر باری
خودی کا فلسفہ ہم دوسروں کے پیش کرتے ہیں
مگر خود فائدہ اس کا اٹھانے سے ہے بیزاری
جو ہر میدان میں پہلے ہی کوسوں ہم سے آگے ہیں
انہی قوموں کو دیں ہم اور درسِ تیز رفتاری؟
مسلمانانِ پاکستان شاید چاہتے یہ ہیں
کہ خود سوئے رہیں دنیا کو دیں پیغامِ بیداری

عمل میں جس سخن کا ترجمہ ہونا ضروری تھا
ہے انگریزی میں اس کے ترجمہ کرنے کی تیاری
اسدؔ اس قسم کی تجویز جب سننے میں آتی ہے
زبانِ دل پہ ہوتا ہے یہ شعر اقبال کا جاری
"اُس اندیشے سے ضبط آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مُغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری"

طلوع اسلام۔ مئی ۱۹۵۰ء

Scanned with CamScanner

پیغامِ اقبال

(یہ نظم ۲۱ر اپریل ۱۹۵۱ر کو کراچی کے جلسۂ یومِ اقبال میں پڑھی گئی)

اثرِ گردشِ ایام سے کچھ کام نہیں
انقلابِ سحر و شام سے کچھ کام نہیں
اپنے اپنے ہی خیالات میں افراد ہیں گم
شورِ ہنگامۂ اقوام سے کچھ کام نہیں
دردِ ملت کے بیاں سے بھی سکوں ملتا ہے
زندگی کے غم و آلام سے کچھ کام نہیں
اب تو موقع ہی کہاں عاقبت اندیشی کا
محوِ آغاز ہیں انجام سے کچھ کام نہیں
روحِ اسلام نے گرویدہ کیا ہے اتنا
صورت و ہیئتِ اسلام سے کچھ کام نہیں
سن لیے ہیں جو کچھ اسلام کے زرین اصول
غش انہی پر ہیں خود اسلام سے کچھ کام نہیں
نام قرآن کا تقریر میں لیتے ہیں ضرور
اور قرآن کے احکام سے کچھ کام نہیں
کوئی مقصد ہی نہیں شہرتِ ارزاں کے سوا
نام سے کام ہے اور کام سے کچھ کام نہیں
یومِ اقبال تو ہر سال منا لیتے ہیں
لیکن اقبال کے پیغام سے کچھ کام نہیں

شعر پر وجد ہے دل عشق سے بے تاب نہیں
جام پر مست ہیں اور ذوقِ مئے ناب نہیں

کبھی سوچا ہے کہ اقبال کا پیغام ہے کیا؟
وحی کی شرح جو کرتا ہے وہ الہام ہے کیا؟
ہم سمجھتے تھے کہ اسلام ہے اپنا مقصد
اس نے سمجھایا کہ خود مقصدِ اسلام ہے کیا؟
ہے نہاں کونسی تہذیب میں انساں کا شرف
روشِ خاص ہے کیا رسم و رہِ عام ہے کیا؟
یوں تو ہیں سب کے لیے عام کسی کے الطاف
جو مسلماں پہ ہوا خاص وہ انعام ہے کیا؟
چشمِ اسلام میں جمعیتِ آدم کیا ہے
نگہِ غرب میں جمعیت اقوام ہے کیا؟
اک تصوّر کے سوا کیا ہے اخوت کا اثر
اک تخیل کے سوا عالمِ اسلام ہے کیا؟
اتحاد اپنے لیے سب سے بڑی نعمت تھی
قدرِ نعمت جو نہ کی ہم نے تو انجام ہے کیا؟
اُس طرف ہم سے یہودی نے فلسطین لیا
ہند نے خطۂ کشمیر اِدھر چھین لیا

آہ شیرازۂ ملّت کا پریشاں ہونا
ہو کے مُسلم وطن و قوم پہ نازاں ہونا

کوئی کیا عظمتِ اسلام کو تسلیم کرے
جب مسلماں کو بھی آیا نہ مسلماں ہونا

چشمِ اقبال میں توحید کا حاصل ہے یہی
اہلِ توحید میں وحدت کا نمایاں ہونا

ربط باہم ہو تو وحدت میں نہیں ہے حائل
عرب و بربر و ایرانی و افغاں ہونا

اک بدن کے لیے درکار ہے اک قلب و دماغ
جملہ اعضا کا ضروری نہیں یکساں ہونا

غیریت ہی کی علامت ہے اگر غور کریں
اتفاق اور تعاون کا بھی پیماں ہونا

نہیں وحدت کے لیے صرف اخوت کافی
چاہیئے یک نگہ و یک دل و یک جاں ہونا

ایسی وحدت جو پھر اک بار ہویدا ہو جائے
دوسرا خواب بھی اقبال کا سچا ہو جائے

(طلوع اسلام مئی ۱۹۵۱ء)

★

عصرِ اقبال

قول یہ اقبال کا تھا شاعر فردا ہوں میں
اس سبب سے انجمن کے درمیاں تنہا ہوں میں
بس کہ پُر تاثیر تھی اس کی صدائے درد ناک
بلبل تنہا کے نالوں سے ہوئے دل چاک چاک
زندگی میں کارگر ہونے لگا اس کا پیام
بعد رحلت اور بھی روشن ہوا اس کا کلام
معترف سب حکمت اقبال کے ہونے لگے
مشرق و مغرب میں اس کے ترجمے ہونے لگے
بہرہ یاب اس کے سخن سے ہو رہے ہیں آج سب
ترکی و شام و عراق و مصر و ایران و عرب
رات دن اس کی نواؤں سے فضا معمور ہے
اس کے نغمے نشر کرنے پر ہوا مجبور ہے
آگیا ہے عالمِ افکار میں اک زلزلہ
کروٹیں لینے لگا ہے زندگی کا ولولہ
ہے جو تحریک اتحادِ عالمِ اسلام کی
یہ بھی اک تشکیل ہے اقبال کے پیغام کی
عالمِ اسلام کے فکر و نظر پر چھا گیا
وقت کے افکار پر اقبال غالب آگیا
خلد نو میں سب سے اونچا قصر ہے اقبال کا
حق تو یہ ہے عصرِ حاضر عصر ہے اقبال کا

ماہ نو - اپریل ۱۹۵۲ء

پیغامِ اقبال اور ہم

یہ نظم ۲۱۔ اپریل ۱۹۵۲ء کو یوم اقبال کے جلسۂ جہانگیر پارک کراچی میں پڑھی گئی

اک جہاں بہرہ ور اقبالؒ کے الہام سے ہے
ہم مگر وہ ہیں جنہیں عشق فقط نام سے ہے

ذوق

رُوشناس اس نے کیا رومی و رازی سے ہمیں
دوستی اپنی ابھی حافظ و خیام سے ہے

تمدّن

کہا تعمیرِ خودی پر ہے تمدّن کی بنا
ہم نے جانا کہ یہ تعمیرِ درو بام سے ہے

پردہ

عورتوں کے لیے کی اس نے جو تلقینِ حجاب
ہم سمجھتے رہے شاعر کے یہ اوہام سے ہے

مجلسِ اقوام

انجمن جس کو وہ کہتا ہے کفن دزدوں کی
رابطہ اپنا اسی مجلسِ اقوام سے ہے

فتنہ

جس کے فتنے سے ہمیں اس نے خبردار کیا
ہم کو امید اسی فطنتِ ناکام سے ہے

حرم

اس نے تعمیر حرم پر ہمیں مائل تو کیا
پھر بھی الفت ہمیں افرنگ کے اصنام سے ہے

جمہوریت

اس نے بخشے کو کہا ہیئتِ جمہوری سے
اور ہمیں اُنس اسی کے قفس و دام سے ہے

وطنیت

تھا جہاد اس کا ہمیشہ وطنیت کے خلاف
اپنے نزدیک مقدم وطن اسلام سے ہے

وحدتِ ملّت

ہم کو لاکھ اس نے دیا وحدت ملّت کا سبق
پھر بھی تنظیم ہماری ابھی اقوام سے ہے

قرآن

کہا قرآن سے ملتی ہے مسلماں کو حیات
اور ہمیں کد ہے تو قرآن کے احکام سے ہے

اسلام

اس کو تو فکر چمن بندیٔ اسلام کی تھی
ہم کو اندیشہ چمن بندیٔ اسلام سے ہے

اس نے جو کچھ بھی کہا ہم نے کیا اس کے خلاف
کس قدر ضد ہمیں اقبالؒ کے پیغام سے ہے

طلوع اسلام مئی ۱۹۵۲ء

اقبال سے سوال

سائلِ پاکستانی

بارہا ہم نے پڑھا تیرا کلام
پہ نہ سمجھے عقل کا اصلی مقام
دے کے درسِ دانش و تدبیر بھی
کی ہے تو نے عقل کی تحقیر بھی
فلسفی بھی ہے تو اور شاعر بھی ہے
عقل و دل کا مسئلہ کر تو ہی طے
نکتہ یہ سب کو کہاں معلوم ہے
عقل کب محمود کب مذموم ہے؟

عارفِ مشرق

"عقل اندر حکم دل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شد شیطانی است"

سائل پاکستانی

صدمۂ فرقت سے دل ہیں پاش پاش
اہلِ ایماں کو خدا کی ہے تلاش
وسعتِ آفاق میں ڈھونڈیں اسے
یا خودی کے طاق میں دیکھیں اسے
غنچۂ امیدِ دل کیونکر کھلے
یہ بتا آخر خدا کیونکر ملے؟

عارفِ مشرق

"از جدائی گرچہ آید جاں بلب
وصل او کم جو رضائے او طلب"

سائل پاکستانی

ہم اگر ہو جائیں پابندِ رضا
کس طرح پورا ہو دل کا مدعا
چاہیئے اس کی رضا کی جستجو
یا کریں سعیٔ فروغِ آرزو؟

عارف مشرق

"چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود"

سائل پاکستانی

نام لیوا ہم بھی ہیں اسلام کے پیشوا پھر کیوں نہیں اقوام کے

عارف مشرق

"کعبہ آباد است از اصنام ما
خندہ زن کفر است بر اسلام ما"

سائل پاکستانی

اہلِ مغرب کی ترقی دیکھ کر بن گئی آئینۂ حیرت نظر
ان کی دولت ان کی قوت ان کی فوج ان کی حکمت ان کی عظمت ان کا اوج
ان کی سیرت ان کا علم ان کا ہنر ہے زمانے میں نمایاں کس قدر؟
اس تمدن میں ہے اتنی آب و تاب کیوں نہ ہم بھی ہوں اُسی سے بہرہ یاب؟

عارف مشرق

"گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ
من بجز عبرت نہ گیرم از فرنگ"

سائل پاکستانی

مُلک ابھی اپنا نہیں ہے خود کفیل قوم کی ہو زندگی کی کیا سبیل؟
اہل یورپ سے ہم آزاد آج ہیں ان کی اشیا کے مگر محتاج ہیں
کچھ نہ لیں گے ان سے تو پائیں گے کیا ہم بھلا پہنیں گے کیا کھائیں گے کیا؟

عارف مشرق

"آنچہ از خاک تو رست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور"

سائل پاکستانی

تجھ پہ روشن دین حق کی اصل و فرع — آشکارا ہم پہ کر اسرارِ شرع
کیا ہے آخر مقصدِ دینِ متیں — کیا ہے آخر حاصلِ شرعِ مبیں

عارفِ مشرق

"کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این ست و بس"

ماہِ نو - اپریل ۱۹۵۳ء

سیرتِ اقبالؒ

(یہ نظم جلسہ یومِ اقبال میں پڑھی گئی جو جہانگیر پارک کراچی میں ۲۱ اپریل ۵۳ء کی شب زیرِ صدارت عالی جناب ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے سفیرِ مصر منعقد ہوا)

سیرتِ حضرتِ اقبالؒ کے بارے میں اسدؔ
واقعہ ایک سناتا ہوں جو مشہور نہیں

وائسرائے نے انہیں پاس بلایا اک بار
ایسی چاہت سے جو انگریز کا دستور نہیں

خط کے انداز میں ملتا تھا اشارہ اس کا
وعدہ منصب کا مقدر ہے جو مذکور نہیں

جس قدر جلد بھی ممکن ہوا پہنچے اقبال
کیونکہ لاہور سے دلی بھی بہت دور نہیں

وائسرائے نے کہا آپ بہ ایں فضل و کمال
ہے تعجب کسی عہدہ پہ بھی مامور نہیں

کامیاب آپ رہے کام میں اپنے بیشک
کون کہتا ہے کہ سعی آپ کی مشکور نہیں

خادمِ قوم تو ہیں آپ یقیناً لیکن
خدمت آخر کسی اک شکل میں محصور نہیں

قوم کے ساتھ کچھ اب ملک کی خدمت بھی کریں
خدمتِ ملک غمِ قوم سے مہجور نہیں

شہرتِ عام سے ظاہر ہے کہ اس وقت کوئی
آپ سے بڑھ کے نمائندۂ جمہور نہیں
سوتھ افریقہ میں ایجنٹ گورنر جنرل
اک نیا عہدہ ہے جس پہ کوئی مامور نہیں
پیش کرتا ہوں میں اور آپ اسے کرلیں قبول
آپ کے جذبۂ ایثار سے کچھ دور نہیں
ہے مگر شرط کہ اس ملک میں لیڈی اقبال
نہ کریں پردہ کہ واں پردے کا دستور نہیں
سُن کے اقبالؒ یہ بولے یہ تو کیونکر میں کہوں
عزت افزائی پہ میں خرم و مسرور نہیں
خدمتِ ملک پہ تیار ہوں گو میرے لیے
منصب وجاہ علاجِ دلِ رنجور نہیں
لیکن اسلام کی تعلیم پہ رکھتا ہوں نظر
شکر ہے چشمِ بصیرت مری بے نور نہیں
ایک سیدھا سا گنہگار مسلمان ہوں میں
اور کسی زہد و عبادت پہ بھی مغرور نہیں
گو بجا لا نہ سکوں دیں کی کوئی خدمتِ خاص
دیں کی توقیر گھٹانے پہ تو مجبور نہیں
پردہ عورت کا ہے منصوص شعارِ اسلام
اس کی توہین کسی حال میں منظور نہیں

ہفت روزہ "الشمس"، ملتان۔ یکم تا ۷ مئی ۱۹۸۴ء

متفرق اشعار

کیا ہے پاکستان اے نادان اس کی قدر کر
یہ تو میراثِ جناحؒ و ترکۂ اقبالؒ ہے

بجھ گئی شمع جو اقبال کے اٹھ جانے سے
سوز باقی نظر آتا نہیں پروانوں میں

منحوس تھا ہمارے لیے کس قدر یہ سال[1]
اقبال بھی ہمارا گیا اور کمال بھی

اسد گلہ یہ ہمیں ترک بھائیوں سے بھی ہے
نہیں رہا انہیں اندازۂ ہلال و صلیب
یہ آرزو ہے کہ ان کو میاں بشیر احمد
سنائیں حضرتِ اقبال کا یہ شعرِ غریب
"سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب"

---

[1] ۱۹۳۸ء کی طرف اشارہ ہے۔ کمال سے مراد اتاترک مصطفٰے کمال ہے۔

1239

قبالۂ حامدی

اقبال اکادمی پاکستان

Scanned with CamScanner